اسلامی معیشت

(رہنما اصول)

حجۃ الاسلام علامہ طالب جوہری

ادارہ مدینۃ العلوم کراچی

حجۃ الاسلام علامہ
طالب جوہری

اِسلامی معیشت

(رہنما اصول)

ادارۂ مدینۃ العلوم، کراچی
۸۹/۱۵ - فیڈرل بی ایریا، کراچی نمبر ۳۸

نام کتاب ——— اسلامی معیشت (رہنما اصول)

مصنف ——— حجۃ الاسلام علامہ طالب جوہری

ناشر ——— ادارہ مدینۃ العلوم کراچی

۸۹/۱۵، فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

طابع ——— ماس پرنٹرز ناظم آباد کراچی ۱۸

اشاعت اوّل ——— اگست ۱۹۸۴ء

قیمت ——— ۱۲ روپے

تعاون واشتراک

○

سیّد حبیب احمد

○

ابنِ عبّاس نقوی

○

زیرِنظر رسالہ حجت الاسلام والمسلمین حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی کا تحریر کردہ ہے — علامہ موصوف عہدِ حاضر کے بالغ نظر مفکر اور روشن فکر مجتہد ہیں۔ ان کی نگاہ اسلامی علوم کے مختلف شعبوں پر مساویانہ حیثیت سے محیط ہے۔ موصوف نے غالباً ۱۹۶۸ء میں ایک وقیع علمی ادارے کے لئے یہ مقالہ تحریر کیا تھا جس میں اسلامی معیشت کے رہنما اصولوں کو متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ہم اس مقالہ کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے اور اس کی افادیت کو عام کرنے کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ ہم سب کو قرآن، اسلام اور فقہِ جعفری کی خدمت کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

موضوع | صفحہ

(۱) مقدمہ ۲

(۲) سرمایہ داری ۳

(۳) اشتراکیت ۱۱

(۴) اسلام ۲۳

(۵) معاشی نظریہ کے عناصر ۲۶

(۶) معاش کی اجتماعی ضمانت ۳۵

(۷) زراعت ۳۸

(۸) محنت ۴۳

(۹) ۱۔ تجارت ۵۰

(۱۰) ۲۔ تجارت ۵۷

(۱۱) سُود ۶۳

(۱۲) بینکاری ۶۷

(۱۳) شرکتیں ۷۰

(۱۴) سرکاری مالیات ۷۱

(۱۵) حکومت کے ذرائع آمدنی ۷۲

(۱۶) حکومت کے اخراجات کی مدیں ۸۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

انسان سنین و شہور کا ایک طویل فاصلہ طے کر کے آج کے عہد تک پہنچا ہے۔ وہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی فکری، ثقافتی اور تہذیبی میراث کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کے باوجود زندگی کی عجیب و غریب پیچیدگیوں کا شکار ہے۔ ایک طرف مال و دولت کی فراوانی ہے، ناز و نعم کا بے جا بھرپور استعمال ہے اور زندگی گذارنے کے لئے ہر سہولت اور ہر تعیش موجود ہے اور دوسری طرف اس کرۂ ارض کی اکثریت فقر و فاقہ کے بوجھ تلے کراہ رہی ہے اور ایک عام انسان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی، سر چھپانے کے لئے مکان اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا میسر نہیں، کیا انسانیت کا یہی فیصلہ ہے کہ اس دنیا کے سارے وسائل معیشت ایک اقلیتی طبقہ کی نجی ملکیت بن کر رہ جائیں اور اسی دنیا کے بیشتر انسان بھوک، عریانی، بیماری، جہالت، بیروزگاری اور پست معیارِ زندگی کو اپنا مقدر بنالیں۔ ایک وقت کی روٹی کے عوض اپنی اولاد کو فروخت کر دیں اور ایک گز کپڑے کی خاطر اپنی عصمت کو زر کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔ یہی وہ مسائل ہیں جن سے آج کا انسان دوچار ہے اور جنھیں حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس وقت دنیا میں صرف تین معاشی نظام ایسے ہیں جو ان مسائل کو حل کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں، سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام۔

زیرِ نظر رسالہ میں ان معاشی نظاموں کا سرسری مطالعہ کیا جائے گا اور اسلام کے نظامِ معیشت پر نسبتاً تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

سرمایہ داری

سرمایہ داری نظام فرد اور اس کے مفادات پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ اگر افراد کے مفادات مہیا اور محفوظ کرلئے جائیں تو فطری طور پر معاشرہ کے مفادات کا تحفظ ہوجائے گا اس لئے کہ معاشرہ کیا ہے؟ صرف افراد کے اجتماع کا نام ہے۔ یہ نظام فرد کو تین طرح کی آزادیوں کی ضمانت دیتا ہے، آزادئ سیاست، آزادئ معیشت اور آزادئ فکر۔

چند بنیادی ارکان اس نظامِ معیشت کے چند بنیادی ارکان یہ ہیں :

۱ ۔ **ذاتی مفاد** :۔ دراصل ذاتی مفاد ہی وہ چیز ہے جو انسان کو عمل اور محنت پر آمادہ کرتی ہے۔ اگر انسان پر اس کی ذاتی منفعت کے دروازے کھول دیئے جائیں تو وہ اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی پوری کوششیں صرف کردیگا اور اس کا یہ فعل ملکی پیداوار میں اضافہ کا سبب ہوگا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ذاتی مفاد کی طمع اِنسان کی سرشت کا ایک جزو ہے وہ اسے اپنی ذات سے کسی صورت میں الگ نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر یہی مفاد اجتماعی مفاد سے متصادم ہوجائے تو یہ پوری انسانیت کے لئے ایک لعنت قرار پائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے استحصال پر چند پابندیاں عائد کردی جائیں۔

۲ ۔ **آزاد انفرادی ملکیت** :۔ فرد کو آزاد حقِ ملکیت حاصل ہے۔ ہر وہ چیز جسے بھی ذریعے اسے ملے وہ اس کی ملکیت ہے اور اسے اس میں حقِ تصرف

حاصل ہے۔ حکومت اس کے حقِ ملکیت اور حقِ تصرف کی محافظت کا فرض انجام دیگی۔ اس ملکیت کے دائرے میں صرف وہ اشیاء ہی نہیں آتیں جو شخصی حاجات کی تسکین کا سبب بنتی ہیں بلکہ اس میں سارے وسائلِ پیداوار بھی داخل ہیں خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں یا مشین یا خام مواد کی شکل میں۔ لہٰذا فرد کو حق حاصل ہے کہ وہ ساری چیزوں کو اپنے دائرۂ ملکیت و تصرف میں لا کر بیش از بیش دولت جمع کرے۔

آزاد انفرادی ملکیت کا یہ نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے اس لئے کہ اس دنیا میں ہر انسان کو زندگی گذارنے کا مساوی حق ہے۔ اگر ایک شخص مذکورہ بالا حق جواز کا استعمال کرتے ہوئے سینکڑوں انسانوں کی حق تلفی کا یا ان کے فقر و فاقہ کا سبب بنتا ہے تو اسے اس منحوس حقِ ملکیت و تصرف سے روک دیا جانا چاہیئے۔

۲۔ **آزادئ عمل**: فرد کو مکمل حق حاصل ہے کہ اپنی دولت کو جس کام میں چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔ وہ اپنے سارے وسائل کو نفع حاصل کرنے کے لئے صرف کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسے اشیاء کی پیداوار میں ہر اضافہ کا حق ہے اور جس قیمت پر چاہے ان اشیاء کو فروخت کرے اسے کوئی طاقت پابند نہیں کر سکتی۔ اس نظام کے مؤیدین کا یہ کہنا ہے کہ معاشی آزادی ہی سے پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ملکی دولت بڑھے گی۔ حکومت کو چاہیئے کہ اس میں مداخلت نہ کرے بلکہ ان کی اس آزادی کا تحفظ کرے اور موانع کو دُور کرے۔

اس آزادئ عمل میں بھی وہی تباحتیں ہیں جو آزاد انفرادی ملکیت میں ہیں اس لئے کہ جب سرمایہ دار کو اپنی ثروت کے اضافہ کا مکمل اور آزاد حق حاصل ہوگا تو وہ جس طرح چاہے گا اپنے حق کا استعمال کرے گا خواہ وہ عوام کی معاشی بدحالی پر کیوں نہ منتج ہو۔

نظامِ سرمایہ داری کا معاشی مسئلہ

انسان کی چند بنیادی احتیاجات ہیں جن کی تسکین زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے اور

چند احتیاجات ایسی ہیں جو تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ غیر محدود ہیں اور ان کی نسبت سے اشیاء و خدمات جو احتیاجات کی تسکین کرتی ہیں وہ محدود ہیں۔ لہٰذا لامحدود احتیاجات کے مقابل محدود آلاتِ تسکین معاشی مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ جب احتیاجات زیادہ ہوں اور ان کے مقابل آلاتِ تسکین کم ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کی ساری احتیاجات کی مکمل تسکین نہ ہو پائیگی۔ سرمایہ داری کے نزدیک اس معاشی مسئلہ کا حل یہ ہے کہ پیداوار میں ہر ممکن اضافہ کیا جائے اور ملکی دولت اور شخصی آمدنیاں امکانی حد تک بڑھادی جائیں اور ہر شخص کو عمل کی مکمل آزادی دیدی جائے تاکہ وہ ملک کی موجودہ دولت اور پیداوار کا ایک حصہ اپنی ملکیت اور تصرف میں لانے کے لئے مکمل جد وجہد کرے اور ان کے ذریعہ اپنے آلاتِ تسکین فراہم کرے ـــــ اگر غائر نظروں سے دیکھا جائے تو نظامِ سرمایہ داری کا پیش کردہ معاشی مسئلہ اور اس کا حل دونوں غلط ہیں۔

۱۔ معاشی مسئلہ اس لئے غلط ہے کہ تہذیب و تمدن جتنی بھی ترقی کر جائے انسان کی بنیادی احتیاجات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اضافہ اس کی آسائشی یا تعیشی احتیاجات میں ہوتا ہے جن کی حیثیت بنیادی احتیاجات کے مقابلے میں ثانوی ہے، اس لئے معاشی مسئلہ کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ لامحدود احتیاجات محدود ذرائع تسکین سے متصادم ہیں بلکہ یہ ہے کہ اشیاء اور خدمات کو احتیاجات پر عادلانہ طور سے تقسیم نہیں کیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ پیداوار مسئلہ نہیں بلکہ اس کی تقسیم مسئلہ ہے۔

تقسیم کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے احتیاجات کی حدبندی ضروری ہوگی۔ ایک معاشی نظام اگر انسان کو ہر احتیاج کی تسکین کا حق دیدے گا تو کبھی معاشی مسائل حل نہ ہو سکیں گے، اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہر فرد کو اس کی ضروری

احتیاجات کی مکمل تسکین کا حق دیا جائے اور اسی کے لئے جد وجہد بھی کی جائے ۔ جب یہ مسئلہ حل ہو جائے تو پھر آسائشوں کی طرف نگاہ کی جائے اور جائز آسائشوں کی فراہمی کا حق دیا جائے ورنہ اگر پہلے ہی مرحلہ پر ہر انسان کو اپنی ہر احتیاج کی تسکین کا حق دیدیا جائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جن کے پاس دولت ہے اور وسائل کافی مقدار میں مہیا ہیں وہ اپنی ہر احتیاج کو ہر قیمت پر پورا کرلیں گے اور عوام کی اکثریت اپنی ضروری احتیاجات سے بھی محروم ہو کر رہ جائے گی۔ اسی طرح وہ اشیاء اور خدمات جن سے احتیاجات کی تسکین ہوتی ہے ان پر پابندی لگائی جائے کہ ان کی پیداوار پہلے اسٹیج پر صرف ضروری احتیاجات کے لئے ہوگی اور پھر آسائش اور تعیش ۔

مزید یہ کہ مخرب اخلاق واجتماع احتیاجات پر مکمل پابندی عائد کی جائے ۔ اسی طرح تسکین دینے والی اشیاء اور خدمات کے مخرب اخلاق واجتماع استعمال پر بھی پابندی ہو ۔

چونکہ نظام سرمایہ داری فرد کو ہر قسم کی آزادی بخشتا ہے اور اس میں کوئی مداخلت درست نہیں سمجھتا اس لئے اس میں اشیاء اور احتیاجات کا عدم توازن ناگزیر ہے اس لئے کہ ان کی حد بندی آزادی فرد میں مداخلت متصور ہوگی جو کسی صورت میں درست نہیں ۔

۲ ۔ معاشی مسئلہ کا حل یہ بتایا گیا ہے کہ شخصی آمدنیوں اور ملکی پیداوار کے اضافے کے ساتھ ساتھ افراد کو کسب اور پیداوار کی مکمل آزادی دیدی ہے تاکہ وہ بقدرِ استطاعت دولت پیدا کرنے پر قادر ہو سکیں ـــــــ اِس حل سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ معاشی نظام افراد کی احتیاجات کی تسکین کا ذمہ دار نہیں ہے حتیٰ کہ وہ ملک اور معاشرہ کی احتیاجات پوری کرنا چاہتا ہے اور افراد سے اس

بات کا خواہشمند ہے کہ وہ ملکی پیداوار سے اپنا حصہ حاصل کر لیں (حالانکہ ایک معاشی نظام کا مقصد افراد کی احتیاجات کی مکمل طور پر تسکین کرنا ہے۔ ملکوں یا منڈیوں کے احتیاجات کی نہیں) مزید یہ کہ پیداوار کی زیادتی اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتی کہ اس سے سارے افراد کی احتیاجات پوری ہو جائیں گی اس لئے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے مشرقِ وسطیٰ کی ایسی چھوٹی ریاستیں موجود ہیں جن کی پیداوار بعض بڑے ملکوں کی پیداوار سے کئی گنا زیادہ ہے اور آبادی کئی گنا کم۔ اِس کے باوجود کیا وہاں کے سارے افراد کی ساری احتیاجات کی مکمل تسکین ہو سکی ہے؟ یقیناً جواب نفی میں ہو گا۔ یا مثلاً خود پاکستان میں سوتی صنعت خود کفیل ہے لیکن اس کے باوجود کپڑوں کی قیمتوں میں انتہائی اضافہ ہے اور ہر فرد کو تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا ملنے کی بھی ضمانت نہیں ہے۔

طبقاتی نزاع

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ سرمایہ داری نظامِ معاش میں ہر شخص کو تجارت اور اکتساب کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ یعنی مالک اور نوکر، تاجر اور خریدار، مستاجر اور اجیر کے درمیان ہر قسم کے معاملات آزادانہ طے ہوں گے۔ یہ کلیہ اگرچہ اپنے اندر کچھ صداقت رکھتا ہے لیکن اس کا تاریک پہلو یہ ہے کہ جب سارے معاملات آزادانہ طے ہوں گے تو اس سے ایک فریق نے یہ فائدہ اٹھایا کہ پہلے تو سارے وسائلِ پیداوار اپنے ہاتھ میں لے لئے اور دوسرے فریق کو محتاج کر دیا جب وہ مجبور ہو کر فریقِ اوّل کے پاس آیا تو اُس نے اپنی مرضی کی ساری شرائط منوا کر دوسرے کو بے دست و پا کر دیا اور یہیں سے معاشرے میں دو طبقات پیدا ہو گئے۔ جب معاشرہ میں دو طبقہ ایسے پیدا ہو جائیں گے۔

۱۔ اقلیتی طبقہ جو مالک، تاجر اور مستاجر پر مشتمل ہے۔

۲۔ اکثریتی طبقہ جس میں نوکر، خریدار اجیر ہیں اور جن کی خدمات اور آمدنیوں کا

استحصال کیا جا رہا ہے ۔

استعمار اس نظام کی بنیاد ہی یہ ہے کہ پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ یہ اضافہ اسی وقت ہو گا جبکہ خام مواد وافر مقدار میں موجود ہو۔ آزاد مقابلہ کی صورت میں ملک کا خام مواد ملک کے سرمایہ داروں میں منقسم ہو گا اس لئے مزید خام مواد کے لئے دوسرے ملکوں کی طرف نگاہیں اٹھیں گی اور یہیں سے استعمار کی ابتداء ہو گی۔ اور چونکہ پیداوار ضرورت سے زیادہ ہو گی یعنی اس کی کھپت نہ سرمایہ داروں میں ہو سکتی ہے اس لئے کہ ان کی ضروریات اس پیداوار کے مقابلہ میں کم ہوں گی، اور نہ مزدوروں میں اس لئے کہ استحصال کی وجہ سے ان میں قوتِ خرید نہ رہے گی اس لئے لازمی طور پر اس پیداوار کے لئے نئی منڈیوں کی ضرورت ہو گی اور یہ منڈیاں اپنے استعمار کردہ ملکوں میں قائم کی جائیں گی۔

اخلاق نظامِ سرمایہ داری کے ماہرین کے نزدیک ہر وہ شے منفعت بخش ہے جس کی طرف انسان کا میلان ہو، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری، مضر ہو یا مفید۔ اس لحاظ سے مثلاً منشیات جو بہت سے اخلاقی مفاسد کی بنیاد ہیں۔ ان ماہرینِ معاشیات کے نزدیک دولت جمع اور ان کے عاملین ایک اجتماعی خدمت انجام دے رہے ہیں اس لئے کہ بہت سے لوگ ان کی احتیاج رکھتے ہیں ۔ یہ نظام اس فارمولے کی رو سے انسان کو صرف ایک معاشی جانور سمجھتا ہے جسے اپنی معاشی احتیاجات کو پورا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے نزدیک اخلاقی اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس نظام میں اگر تاجر ملاوٹ نہیں کرتا تو اس کا سبب یہ نہیں کہ ملاوٹ ایک اخلاقی جرم ہے بلکہ اس ملاوٹ سے اس کی ساکھ پر اثر پڑ سکتا ہے جو ذاتی مفاد کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر وہ غریب کی امداد کرتا ہے تو یہ سمجھ کر نہیں کہ یہ اس کا اخلاقی فرض ہے بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ وہ غریب ردِ عمل کے طور پر اس کے

مفادات کے خلاف محاذ نہ قائم کرلے ورنہ اگر غریب کی بھوک اور بدحالی اس کی دولت میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے تو وہ اس بھوک اور بدحالی کو ان کی خوشحالی پر ترجیح دے گا۔

مذہب

اس نظام میں خوش حالی کی بنیاد آمدنیوں اور پیداوار کے اضافہ پر ہے خواہ وہ جس طریقہ سے بھی ہو لیکن اس کے برخلاف مذہب پیداوار اور آمدنیوں میں اضافہ کو ظلم، رشوت، سود، ذخیرہ اندوزی اور دیگر ناجائز طریقوں کے ذریعہ کو درست نہیں سمجھتا، اسی طرح نظام سرمایہ داری ہر فرد کو اپنی حاجات کی تکمیل تسکین کا حق دیتا ہے جبکہ مذہب میں یہ حق آزاد نہیں ہے۔ مثلاً اس نظام میں زناکاری، قماربازی، شراب نوشی، موسیقی اور دوسرے لہو ولعب اگر انسان کی ضرورت ہیں تو وہ ان کی تسکین کرسکتا ہے جبکہ مذہب ان کی اجازت نہیں دے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس نظام میں ہر وہ چیز جو انسان کی ضرورت کی تسکین کرے دولت ہے اور مذہب میں بہت سی تسکین کرنے والی چیزیں حرام ہیں اور دولت نہیں ہیں۔

اصلاحات اور لاعلاج امراض

نظامِ سرمایہ داری کے مؤیدین کی نگاہوں میں بھی اس کی خرابیاں اظہر من الشمس تھیں: وہ دیکھ رہے تھے کہ سرمایہ دار بیشتر پیداوار کی خاطر مزدور کی طاقتوں کا استحصال کررہا ہے اور اس کی محنت کے عوض اتنی اجرت دے رہا ہے جو اس کی دو وقت کی روٹی کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی اور اس کے ردِ عمل کے طور پر مزدور طبقہ میں شورش اور ہیجان کے اثرات نمایاں ہیں۔ ایسی صورت میں نظامِ سرمایہ داری میں اصلاحات کی گئیں اور مظلوم اکثریتی طبقہ کو چند رعایات سے سرفراز کیا گیا۔ اس کا سبب کچھ یہ بھی تھا کہ جمہوریت کے تقاضوں نے عوام کو حقِ رائے دہی تفویض کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ بعض ملکوں کے پرولتاری انقلابات بھی اس بات کا سبب بنے کہ دوسرے

ملکوں میں مزدوروں کی لگام کو ڈھیلا کر دیا جائے۔ ان سارے عوامل نے مل جل کر جدید سرمایہ داری میں جو اصلاحات کروائیں وہ یہ ہیں کہ ایک طرف مزدور کی اُجرت بڑھائی گئی اور دوسری طرف اوقاتِ کار میں تخفیف کی گئی، حکومت کو مزدور اور سرمایہ دار کے جھگڑے میں مداخلت کا حق دیا گیا۔ مزدور انجمنوں کا اعتراف کیا گیا۔ ذاتی منفعتوں پر اس حد تک پابندی لگائی گئی کہ وہ اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہوں۔ غریبوں پر سے ٹیکس کی مقدار کم کی گئی اور اس کی نسبت امیروں پر ٹیکس کی مقدار بڑھادی گئی۔ غرضکہ مختلف اصلاحات کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ مزدور ایک حد تک مطمئن ہو جائے تاکہ نتیجۃً سرمایہ داری کی عمر میں اور چند برسوں کا اضافہ ہو سکے۔ لیکن سرمایہ داری اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے جن باتوں کی متقاضی ہے وہ ان ساری اصلاحات کے باوجود ایک مطمئن معاشرہ کی تشکیل سے عاجز ہیں۔

ان ساری اصلاحات کے باوجود اب بھی انسان اسی بھیانک تضاد سے دوچار ہے کہ ایک طرف انسانوں کی اکثریت بھوک اور برہنگی سے عاجز ہے اور دوسری طرف ایک مختصر گروہ دنیا کی ساری نعمتوں سے مالامال ہے۔ ایک طرف دنیا کے لاکھوں کارخانے اشیاء کا ڈھیر لگا رہے ہیں، اور دوسری طرف خریداروں سے قوتِ خرید سلب کی جارہی ہے۔ ایک طرف ہزاروں فیکٹریاں، آلاتِ تعیش کی پیداوار میں منہمک ہیں اور دوسری طرف ہزاروں انسان اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے ترس رہے ہیں۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے تضادات سرمایہ داری کا مقدر بن چکے ہیں جن کا کوئی حل اس کے پاس موجود نہیں ہے۔

اشتراکیت

اس بحث میں اشتراکیت کے چھوٹے بڑے فرقوں کو چھوڑ کر صرف بنیادی نظریات پر گفتگو کی جائے گی۔ اشتراکیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جب ذرائع پیداوار قومی ملکیت بن جائیں اور انسان دوسرے انسان کا استحصال کرنے سے باز آجائے تو معاشرہ ایک مقررہ مدت تک اس اصول پر کام کرے گا کہ ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ یہ اشتراکیت کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ لیکن جب وہ اعلےٰ تر منزلوں میں قدم رکھے گا تو اس کا اصول یہ ہوگا کہ ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق معاوضہ دیا جائے ـــــ ابتدائی مرحلہ سوشلزم ہے اور ارتقائی منزل کمیونزم ہے۔

اشتراکیت کے تاریخی نقطۂ نظر سے انسان پر مندرجۂ ذیل ادوار گذر رہے ہیں:-

۱۔ ابتدائی کمیونزم کا دَور۔

۲۔ غلامی کا دَور۔

۳۔ جاگیرداری کا دَور

۴۔ سرمایہ داری کا دَور

۵۔ اشتراکیت کا دَور

اس کا خیال ہے کہ دُکھی انسانیت کی نجات اسی میں مضمر ہے کہ انسان پھر کمیونزم کی طرف پلٹ جائے۔ اسٹالن نے ۱۹۳۷ء میں کہا تھا کہ وہ معاشی اصول جن پر کمیونزم کی بنیاد

ہے، وہ تین ہیں :-

۱۔ مکمل طور پر انفرادی ملکیت کا خاتمہ۔

۲۔ مکمل طور پر طبقاتی نظام کا خاتمہ۔

۳۔ وسائلِ پیداوار پر حکومت کا مکمل تسلط ـــــ اسی لئے ہم ان تمام معاشی نظاموں کے مخالف ہیں جو ان تین اصولوں پر مبنی نہیں ہیں۔

انفرادی ملکیت کا خاتمہ

اس فارمولے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں آزاد انفرادی ملکیت کی وجہ سے ایک طرف چند افراد پورے معاشرے کے وسائلِ پیداوار پر قبضہ کر کے معاشرہ کی رگوں سے دولت کا ایک ایک قطرہ کھینچ لیتے ہیں اور دوسری طرف عوام بدحالی اور غربت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اشتراکی نظام نے یہ طے کیا کہ وسائلِ پیداوار کو کسی شخص کی نجی ملکیت نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے پورے معاشرے کی مشترکہ ملکیت کی حیثیت حاصل ہوگی۔ افراد معاشرے کی خدمت انجام دیں گے اور معاشرہ اس کے عوض ان کی احتیاجات کو پورا کرے گا۔ اس اعتبار سے افراد میں سے کسی بھی فرد کو وسائلِ پیداوار کو اپنی ملکیت میں رکھنے کا اور ان میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔

اس فارمولے کی تائید میں ایک تاریخی پس منظر پیش کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ انسان کی فطرت میں انفرادی ملکیت نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ اس ابتدائی معاشرے میں جو اشتراکیتِ مطلق کا عہد تھا، کوئی چیز کسی ایک کی ملکیت نہیں تھی بلکہ سب کی تھی، اور لوگ اس دور میں باہمی تعاون اور ہمدردی کے ساتھ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ جب کاشتکاری کی ابتداء ہوئی تو اس وقت زرعی زمینوں پر اور وسائلِ پیداوار پر جھگڑے شروع ہوئے اور اس وقت سے اب تک انسان انفرادی ملکیت کے چکر میں ہے اور یہی چیز طبقاتی نزاع کا سبب بنتی ہے اس لئے اسے ختم ہو جانا چاہیئے۔

اس نقطۂ نظر کے سلسلے میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ یقینی طور پر تاریخ ایسے کسی معاشرہ کی نشاندہی نہیں کرتی جس میں ساری اشیاء انسانوں کی مشترکہ ملکیت تھیں اور معاشرہ کے سارے افراد ان سے بقدر ضرورت استفادہ کرتے تھے اور آپس میں مکمل باہمی تعاون اور ذہنی سمجھوتہ رکھتے تھے۔ یہ فقط ایک مفروضہ ہے اور مفروضہ کا حقیقت ہونا ضروری نہیں ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اگر ہم اس مفروضہ کو درست بھی تسلیم کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ انسان اپنی تاریخ کے ابتدائی عہد میں اسی فارمولے پر کاربند تھا تو اس کے باوجود اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ انفرادی ملکیت کا جذبہ انسان کا فطری جذبہ نہیں ہے اس لئے کہ اس عہد میں انسان درختوں کے پھل اور جانوروں کے گوشت پر گزارہ کرتا تھا۔ ایسی صورت میں اس عہد کے انسان کے پاس پھلوں اور جانوروں کے گوشت کے لئے ایسے وسائل نہیں تھے جن کے ذریعہ وہ ان کا ذخیرہ کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انفرادی ملکیت کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی زراعت شروع ہوئی یہ جذبہ ابھر کر سامنے آگیا۔ یعنی جب ذخیرہ اندوزی کی گنجائش پیدا ہوئی تو ملکیت پر نزاع بھی شروع ہو گئی۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انسان میں انفرادی ملکیت کا جذبہ فطری ہے۔

خالص نظریاتی بحث سے ہٹ کر اگر انسانی نفسیات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ جذبہ اس کی ذات کا ایک ایسا جزو ہے جسے انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور اسی جذبہ کے تحت پیداوار میں اضافہ یا آمدنی میں ترقی ہوتی ہے۔ اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً پانچ آدمیوں کو حکومت کی پچاس ایکڑ زمین میں مشترکہ طور پر زراعت کرنے کیلئے کہا جائے اور اس کی پیداوار سے سارے اخراجات وغیرہ منہا کر کے منافع کو ان پانچ پر تقسیم کر دیا جائے، اور اس کے برعکس پانچ آدمیوں میں سے ہر ایک کے پاس دس ایکڑ زمین ہو جو اس کی ملکیت ہو اور اس میں کوئی اس کا شریک نہ ہو۔ کیا ان دونوں قسموں کے

مزارعین کا شوق، ولولہ اور عمل یکساں ہوگا. پہلی صورت میں کسان کی وہی حیثیت ہوگی جو سرمایہ کے کاخانے پر ایک مزدور کی ہوتی ہے یا جو جاگیر دار کی زمین پر کام کرنے والے ایک کسان کی ہوتی ہے اور نتیجہ کے طور پر وہ اس لگن سے کام نہیں کریگا جو اپنی ملکیت کے لئے ہوتی ہے اسی لئے پیداوار دوسری صورت کے مقابلہ میں یقیناً کم ہوگی۔ اس بات کو اس دلچسپ مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک ڈاکٹر جو کسی اسپتال میں ایک ملازم کے طور پر کام کرتا ہے اس میں اور ایک ایسے ڈاکٹر میں جو اپنے پرائیوٹ کلینک میں کام کرتا ہے بہت فرق ہوتا ہے اور دونوں کے شوق و توجہ کا معیار بھی بہت مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ فرق صرف اس لئے ہوتا ہے کہ ایک میں انفرادی ملکیت کی لگن ہوتی ہے اور دوسرے میں نہیں ہوتی۔

وسائل پیداوار اور قومی ملکیت

اب اس کے دوسرے رُخ پر بھی غور کرنا ہوگا کہ اگر وسائل پیداوار کو قومی ملکیت بنا لیا جائے تو کیا قوم (جو اُن وسائل پیداوار کی مالک ہے) کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ان کو اپنی مصلحت کے مطابق تصرف میں لائے؟ اور اگر قوم کے منتخب کردہ نمائندے اس کے مفاد کے خلاف کام کریں تو کیا قوم کو ان کے ہٹانے کا حق ہوگا؟ ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ اشتراکی حکومت میں قوم کو کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ اشتراکی حکومتوں میں آزاد انتخاب قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ انتخاب میں امیدوار صرف ایک ہی شخص ہوتا ہے جسے پارٹی منتخب کرتی ہے اور اسی کو منتخب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ منتخب شدہ افراد بھی اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے بلکہ وہی کہتے ہیں جو پارٹی کی خواہش ہوتی ہے اور پارٹی خود بنفسِ نفیس کچھ نہیں ہوتی بلکہ اس کا سربراہ ساری چیزوں کا ذمہ دار ہوتا ہے اور سارے امور کا اجراء و نفاذ اسی کی صوابدید سے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ وسائل پیداوار جو ساری قوم کی ملکیت ہیں وہ درحقیقت صرف ایک شخص کی ملکیت ہیں۔

ایسے نظام میں اگر پیداوار کے وسائل قومی ملکیت بنا دیئے جائیں تو عوام کی تین ہی صورتیں ہوں گی ، یا اجرت پر کام کرنے والے ارکانِ حکومت ہوں گے یا اجرت پر کام کرنے والے مزدور یا اجرت پر کام کرنے والے کسان ۔ ممکن ہے کہ بعض اشخاص دنیا میں ایسے ہوں جو ایسی صورتِ حال کو پسند کریں لیکن اکثریت اسے پسند نہیں کر سکتی ۔

طبقاتی نظام کا خاتمہ

مارکس اور اینگلز نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں تحریر کیا ہے کہ اب تک ہر معاشرہ کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ رہی ہے ۔ "آزاد اور غلام ، شریف اور رذیل ، جاگیردار اور زرعی غلام ، استاد اور کاریگر ، غرضکہ ظالم اور مظلوم برابر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے ہیں ۔ وہ کبھی کھلے بندوں اور کبھی پسِ پردہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے ہیں"۔

دونوں مفکروں نے تحریر کو آگے بڑھاتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "جدید سرمایہ داری سماج جاگیری سماج کے کھنڈروں سے اٹھا مگر اس نے طبقاتی اختلافات کو دور نہیں کیا ۔ اس نے محض پرانے کی جگہ نئے طبقے ، ظلم کی نئی صورتیں اور جدوجہد کی نئی شکلیں پیدا کر دیں ــــــ البتہ ہمارا عہد جو سرمایہ داروں کا عہد ہے ایک امتیازی شان ضرور رکھتا ہے ۔ اس نے طبقاتی اختلاف کی پیچیدگیوں کو کم کر دیا ہے ۔ سماج بہ حیثیت مجموعی دن بدن دو بڑی مخالف صفوں میں ، دو بڑے طبقوں ، سرمایہ دار اور مزدور میں بٹتا جا رہا ہے جو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں"۔

اس میں کوئی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اشتراکی مفکرین کا یہ نقطۂ نظر سو فیصدی درست ہے اور انھوں نے معیشت کے سب سے بڑے مسئلہ کو سمجھنے میں انتہائی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کے پیش کردہ حلوں میں وہی انتہا پسندی اور شدت ہے جو کسی جابر معاشرے کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آتی ہے ۔ اس انتہا پسندی کا فطری عمل یہ ہوتا ہے کہ انسان اس جبر سے چھوٹ کر دوسرے جبر میں گرفتار ہو جائے ۔

اشتراکیت کی سب سے بڑی خامی یہی ہے ۔

جن ملکوں میں اشتراکی نظام نافذ ہے وہاں کے حالات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرکاری طور پر طبقات کے خاتمہ کے باوجود وہاں کے ایک ہی طبقہ میں مدارج کا فرق ہے وہ کسی بھی سرمایہ داری معاشرہ کے بھیانک طبقاتی مدارج سے کم نہیں ۔

معاشی نقطۂ نظر کی تلخیص

مارکس نے اپنی کتاب سرمایہ، افلاس فلسفہ اور دیگر چھوٹے چھوٹے رسالوں میں جو معاشی نظریہ پیش کیا ہے اس کی تلخیص کم وبیش مندرجۂ ذیل چار نقروں میں پیش کی جاتی ہے ۔

۱ ۔ کسی شئے کی حقیقی قیمت اس محنت کے تناسب سے ہوتی ہے جو محنت کش اس کے لئے انجام دیتا ہے ۔ مختلف محنت کش ایک ہی چیز کو بنانے میں محنت کی مختلف مقدار صرف کرتے ہیں اس لئے اس تفاوت کی صورت میں اوسط نکالا جائے گا ۔ مثلاً ایک قوی محنت کش ایک دن میں چھ جوتے بناتا ہے اور کمزور ایک دن میں دو ۔ اس لئے اوسط درجہ کا محنت کش وہ ہوگا جو دن میں چار جوتے بنائے ، اس لئے چار جوتوں کی قیمت اس محنت کے مساوی ہوگی جو متوسط درجے کے محنت کش نے انجام دی ہے ۔

۲ ۔ سرمایہ دار اس محنت کے عوض جو اجرت ادا کرتے ہیں وہ صرف اتنی ہوتی ہے کہ محنت کش اس سے بہ مشکل اپنی گزر اوقات کر سکے جبکہ وہ اس شئے سے جو منفعت حاصل کرتے ہیں وہ اجرت سے بہت زیادہ ہوتی ہے ۔ یعنی شئے کی کم اجرت محنت کش کو ادا کی گئی ہے اور زیادہ قیمت پر وہ شئے فروخت کی جا رہی ہے ۔ اجرت اور قیمت کے درمیان جو نفع سرمایہ دار کو حاصل ہو رہا ہے وہ درحقیقت وہ محنت کش ہی کا حق ہے جسے سرمایہ دار غصب کر لیتا ہے ۔

یہی قدرِ زائد سرمایہ داری کو جنم دیتی ہے ۔

۳ ۔ نظامِ سرمایہ داری کی آزادی سعی اور آزادی پیداوار بڑی مشینی صنعتوں اور چھوٹی صنعتوں کے درمیان مقابلہ کا راستہ کھول دیتی ہے جس کے نتیجہ میں پہلے گروہ والے دوسرے گروہ پر غالب آجاتے ہیں اور معاشرہ دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے یعنی امیر اور غریب ۔

۴ ۔ محنت کش مظلوم ہے اس لئے کہ سرمایہ دار اس کے حق سے قدرِ زائد کو غصب کر لیتا ہے اور پھر اُسے اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے اس لئے محنت کشوں کو چاہیئے کہ وہ سرمایہ داروں کے خلاف انقلاب کریں ۔ ان پر غلبہ حاصل کریں اور سرمایہ داری نظام کو اشتمالی نظام میں تبدیل کر دیں اس لئے کہ سرمایہ دار کے مقابلے میں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے اور قوت بھی ۔ اور پھر یہ کہ جب یہ حقدار ہیں تو انھیں اپنے حق کو سرمایہ دار سے واپس چھین لینا چاہیئے ۔

تنقید

۱ ۔ مارکس کا یہ خیال بالکل عام ہے کہ شئے کی قیمت کا تعین درحقیقت اس محنت سے ہوتا ہے جو ایک متوسط درجہ کا محنت کش اس شئے کے پیدا کرنے میں صَرف کرتا ہے ، اس میں کسی خاص شئے کی تخصیص نہیں ہے بلکہ ہر شئے داخل ہے حالانکہ بہت سی ایسی اشیاء ہیں جن پر یہ حکم منطبق نہیں ہوتا خصوصاً وہ چیزیں جن کا تعلق فنی صلاحیتوں سے ہوتا ہے ۔ ان میں وقت کے ساتھ ساتھ فنی صلاحیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے ۔ فرض کیجئے کہ ایک مصور دو دن میں ایک تصویر تیار کرتا ہے جبکہ دوسرا مصور ویسی ہی تصویر دو ہفتے میں تیار کرتا ہے پھر بھی وہ نفاست میں وہ پہلی تصویر کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو کیا ایسی صورت میں دونوں کو ایک ہی قیمت دی جائے گی ؟ حالانکہ ان دونوں کے فنی معیار میں بھی بڑا فرق ہے اور وقت میں بھی بہت تفاوت ہے ۔ پھر یہ سوال

بھی پیدا ہوتا ہے کہ اجرت کس وقت کے اعتبار سے دی جائے گی۔ پہلے مصرف کے وقت کے اعتبار سے یا دوسرے کے یا متوسط کے!

حقیقت یہ ہے کہ مارکس کا یہ نقطۂ نظر بالکل ہی غلط ہے کہ کسی شئے کی قیمت صرف وہ محنت ہے جو اس کے پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اور بھی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو قیمت کی تعیین میں بڑا دخل رکھتی ہیں۔ مثلاً وہ خام مواد جس میں محنت کرکے کوئی شئے بنائی گئی ہے اس کو قیمت کی تعیین میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یا وہ منفعت جو اس شئے سے حاصل ہوتی ہے اس کی طلب کی کمی بیشی بھی قیمت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا فقرہ اس بات پر مبنی ہے کہ صرف محنت ہی قیمت کی تعیین کرتی ہے حالانکہ جیسا کہ بتایا گیا، ایسا نہیں ہے بلکہ محنت کے ساتھ ساتھ اور بہت سے عوامل بھی قیمت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ صرف محنت کش ہی پیداوار کا پہلا اور آخری سبب نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کارخانے کے منتظمین، موجد اور سرمایہ دار یہ سب کسی شئے کی پیداوار کا مشترکہ سبب ہوتے ہیں اس لئے اگر قدرِ زائد سے ان کے حق کی ادائیگی کی جائے تو اس میں کیا برائی ہے۔ مزید یہ کہ تاجر درحقیقت محنت کش اور خریدار کے درمیان ایک واسطہ کا کام کرتا ہے۔ اور اس کام پر بھی ویسے ہی محنت صرف ہوتی ہے جیسی محنت کش کارخانے میں کرتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ قدرِ زائد درحقیقت اس کی وساطت اور محنت کی اجرت ہوتی ہے، چوری یا غصب نہیں ہے۔

۳۔ مقابلہ کو بھی مارکس نے غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ بڑی مشینی صنعتوں والے چھوٹی مشینی صنعتوں والوں پر غلبہ پا جاتے ہیں اور یہیں سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔

اگر بات صرف اتنی ہی ہے اور اسی کے حل سے معاشرے کے طبقات ختم ہو سکتے ہیں تو اس کا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مقابلہ پر پابندیاں عائد کر دی جائیں اور بڑی مشینی صنعتوں والوں پر ایسی حد بندیاں لگا دی جائیں جس سے استحصال نہ کیا جا سکے ، اور مشین کے استعمال کی اسی وقت اجازت دی جائے جب اس بات کا انتظام ہو جائے کہ مشین سے متاثر ہونے والے چھوٹے صنعت کاروں پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا۔

۴ - چوتھی چیز کی ضرورت صرف اس وقت پیش آئے گی جب مزدور کا استحصال ہو رہا ہو۔ اگر مزدور ہر طرح مطمئن زندگی گزارے تو پھر انقلاب کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔ اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ مزدور سے انقلاب کروانے کی بجائے ایسی راہِ عمل تلاش کی جائے جس سے مزدور کے حقوق صحیح طور پر محفوظ ہو جائیں۔

فلسفۂ اجتماع

اینگلز نے کیمونسٹ مینی فیسٹو کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ :- "مینی فیسٹو میں نے اور مارکس نے مل کر لکھا ہے اور اسی لئے آج یہ بتا دینا میرا فرض ہے کہ اس مینی فیسٹو کا بنیادی اور مرکزی دعویٰ مارکس کی تخلیق ہے ، وہ دعویٰ یہ ہے کہ ہر تاریخی عہد میں معاشی پیداوار اور تبادلہ کا جو طریقہ رائج ہوتا ہے اور اس سے جو سماجی ڈھانچہ بنتا ہے وہی بنیاد ہے جس پر اس عہد کی سیاسی اور ذہنی تاریخ مرتب ہوتی ہے اور اسی بنیاد سے اس تاریخ کی تشریح ہو سکتی ہے۔"

مارکس اور اینگلز اور دیگر تمام اشتراکی مفکرین کا کم و بیش یہی خیال ہے کہ انسان کی پوری تاریخ معاشیات کے گرد گھوم رہی ہے اور اس کی زندگی کا ہر موڑ معاشی حالات کا مرہونِ منت ہے۔ یہ نظریہ بھی دیگر اشتراکی نظریات کی طرح انتہا پسندی کا آئینہ دار ہے اس لئے کہ یہ تو عین ممکن ہے کہ تاریخی تغیرات میں معاش کو بھی ایک عامل اور سبب کی

حیثیت حاصل ہو لیکن اگر اس کے علاوہ دیگر عوامل و اسباب سے انکار کر دیا جائے تو یہ تاریخ سے ناواقفیت ہو گی۔ مثلاً صلیبی جنگوں کے متعلق کون یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ صرف معاشی اسباب کی بناء پر مدتوں جاری رہیں یا ہنری چہارم کا معاشقہ جو برطانیہ کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے، وہ بھی معاشی اسباب کی بنار پر تھا یا مثلاً قلوپطرہ کا حُسن و جمال جو مصری تاریخ کے تغیر کا سبب بنا وہ بھی کسی معاشی سبب کی بنار پر تھا۔

یہ تو درست ہے کہ معاش ایک اہم انسانی مسئلہ ہے اور معاشرے کے سارے مسائل کا حل معاشیات کے دامن میں پوشیدہ ہے اس لئے کہ معاشرے کو صرف معاشی مسائل ہی پیش نہیں آتے اور وہ صرف معاشی جانوروں کے ریوڑ ہی کا نام نہیں۔ اسے نفسیاتی اور اخلاقی مسائل بھی پیش آتے ہیں۔ ایسے مسائل جن کا معاشیات سے کوئی ربط نہیں ہے۔

فلسفۂ اجتماع اور معاشی نظام

کسی بھی معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ اجتماع سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے دو نظام ہیں۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت۔ سرمایہ داری نظام اجتماع فرد کو مرکزی کردار قرار دیتا ہے اور معاشرہ کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی فرد کی آزادی میں مداخلت کرے اسی بنیاد پر معاشی نظام بھی قائم ہے کہ وہ آزاد اور لامحدود انفرادی ملکیت کو جائز قرار دیتا ہے (اگرچہ اشتراکیت کے خوف نے اب اس فارمولے میں ترمیم کر دادی ہے) اس کے برعکس اشتراکی نظام اجتماع معاشرہ کو مرکزی کردار قرار دیتا ہے اور فرد کو فرد کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا، اسی لئے اس کا معاشی نظام انفرادی ملکیت کو درست نہیں سمجھتا، وہ وسائلِ پیداوار کو حکومت کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو درحقیقت معاشرہ یا قوم کی نمائندہ ہوتی ہے۔

اِس گفتگو کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب ہم سرمایہ داری یا اشتراکیت کے معاشی نظام کو اپنائیں گے تو اس کے فطری لازمہ کے طور پر اس کے اجتماعی نظام کو بھی اپنانا ہوگا۔

اخلاق

اینگلز نے ۱۸۷۷ء میں کہا تھا کہ اخلاق اجتماعی حالات کی پیداوار ہوتا ہے اور چونکہ اجتماعی حالات متغیر ہوتے رہتے ہیں اِس لئے ضروری ہے کہ اخلاقی مفاہیم بھی متغیر ہوں ـــــــ وہ اخلاق جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں وہ، ہر وہ فعل ہے جس سے ہمارے نظریات کو فتح حاصل ہو خواہ وہ فعل اخلاق رائجہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

لینن نے کہا ہے کہ فریڈرک اینگلز نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہمارے نظریات کی بنیاد مادہ پر ایمان رکھنا ہے نہ کہ روح پر ـــــــ اس لئے ہم جس اخلاق پر ایمان رکھتے ہیں وہ مادی حقائق سے ماخوذ ہے روحانی یا مثالی دنیا سے نہیں، اور جب مادی حقائق ہم پر اشتمالیت کی عملی تطبیق کو لازم قرار دیتے ہیں تو یہ فطری بات ہے، کہ ہماری نظر میں اخلاقِ حسنہ وہی ہوں گے جو ہمارے اشتمالی مقاصد کے پورا کرنے والے وسائل کے مترادف ہوں۔

جب ان مفکرین کے نزدیک اخلاق کا مطلب اپنے نظریہ کو بہر طور نافذ کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ اگر نفاذ کے لئے ظلم وجور، جبر وتعدی اور مکر وفریب کی ضرورت ہوگی تو وہی اشتراکی اخلاق قرار پائے گا۔

اسٹالن نے ایک مقام پر کہا ہے کہ ہمیں لینن نے وصیت کی ہے کہ ہم اپنے داخلی وبیرونی دشمنوں سے برتاؤ کرنے میں ظالم وجابر رہیں، اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ ہم استبداد پر ایمان رکھتے ہیں، ہم سرکشی پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم ظلم پر ایمان رکھتے ہیں ـــــــ اس لئے کہ ہمارا انقلابی نظام

کو جو طبقات کے خاتمہ پر منتج ہے، اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم ان سارے وسائل سے کام لیں۔ لینن نے بھی تقریباً اسی قسم کی بات ایک موقع پر کہی تھی کہ ضروری ہے کہ ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لئے سارے وسائل سے کام لیں خواہ وہ غیر قانونی ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ مکر و فریب اور جھوٹ اور چاپلوسی ہی پر کیوں نہ مبنی ہوں۔

اس قسم کے اقوال جستہ جستہ پورے اشتراکی لٹریچر میں بھرے پڑے ہیں۔

دین و مذہب اشتراکیت کے نزدیک دین و مذہب ایک لغو چیز ہے، اور یہ ہمیشہ ظالم طبقہ کا آلۂ کار رہا ہے۔ اشتراکیت کے نفاذ کیلئے اس کا ختم ہونا ضروری ہے۔

۱۔ مارکس اور اینگلز کمیونسٹ مینی فیسٹو میں کہتے ہیں کہ قوانین، اخلاقیات اور مذاہب مزدور کے لئے بورژوائی اوہام ہیں جن کے پیچھے بورژوائی طبقہ کی مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں۔

۲۔ لینن نے ۱۹۰۲ء میں کہا تھا کہ ہم جتنا دین کے تسلط سے آزاد ہوتے جائیں گے اتنا ہی حقیقی اشتراکیت سے قریب ہوں گے ـــــــ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم دین کی خرافات سے اپنی عقلوں کو آزاد کر لیں۔

۳۔ لینن نے ۱۹۱۳ء میں کہا کہ یہ درست نہیں ہے کہ اللہ کائنات کا منتظم ہے ـــــ بلکہ درست یہ ہے کہ اللہ ایک خرافاتی تصوّر ہے۔

۴۔ اسٹالن نے ۱۹۲۰ء میں کہا کہ ہم چونکہ پہلے طاقتور نہ تھے اس لئے اپنے الحاد کے عدمِ اعلان کو ضروری سمجھتے تھے لیکن اب ہم صراحت سے اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ملحد ہیں اور ہم ادیان کو انسانی تہذیب کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔

۵۔ اسٹالن نے ۱۹۴۴ء میں کہا کہ ہم ملحد ہیں ـــــ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کا تصوّر خرافات ہے۔

اِسلام

اسلام ایک آسمانی دین ہے اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ دیگر ادیان کے برعکس اس کے دامن میں ہر اس مسئلہ کا حل موجود ہے جس سے انسان یا انسانی معاشرہ دوچار ہوا ہے یا ہو سکتا ہے۔ وہ اس بات کا بھی دعویدار ہے کہ اس کے پیش کردہ حل کے مقابلے میں دنیا کے تمام مکاتب فکر کے حل غیر مکمل اور ناقص ہیں۔ اس لئے کہ ہر مکتبۂ فکر کے اذہان جغرافیائی عوامل، رنگ و نسل کے محرکات اور مخصوص تعلیم و تربیت کے زیر اثر کسی مسئلہ کا حل تلاش کرتے ہیں لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر ملک و ملت کے ہر انسان کے مزاج اور ماحول سے سازگار ہو، اس کے برعکس وہ حل جو انسانوں اور ملکوں اور ملتوں کی طرف ان کے خالق نے بھیجا ہے ——— وہ اس بات کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے کہ انسانی معاشرے کی ہر ہر فرد کی مکمل تسکین کا سبب بن سکے۔

عدل و انصاف اسلام کے نزدیک انبیاء کی بعثت کا مقصد لوگوں کو عدل و انصاف کی راہ پر چلانا ہے۔ خواہ اُس کا سیاسی نظام ہو یا معاشی وہ صرف عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہوگا اور اس میں انسانوں کے انفرادی و اجتماعی حقوق کی مکمل نگہبانی کی جائے گی۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:-

۱۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتائی ذی القربیٰ و ینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون۔ (۹۰ نحل) "اللہ عدل و احسان اور قرابتداروں کے ساتھ سلوک کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی سے اور ناپسندیدہ باتوں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔"

۲۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم النّاس بالقسط (۲۵ حدید) "ہم نے اپنے رسولوں کو کھلے نشانوں کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو بھی نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف سے کام کیا کریں"۔

ممدوح دنیا وہ دنیا جو انسان کا مقصودِ اصلی نہ ہو بلکہ اسے آخرت کے مقدمہ کی حیثیت حاصل ہو وہ اسلام کی نگاہوں میں ممدوح ہے۔

۱۔ الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ و فضلاً (۲۶۸ بقرہ) "شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور برائیوں کی ترغیب دیتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے بخشش اور فضل (رزق) کا وعدہ کرتا ہے"۔

۲۔ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (۱۰ جمعہ) "اور جب نماز ختم ہوجائے تو زمین میں پھیل جایا کرو اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو"۔

۳۔ وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا (۷۷، قصص) "اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخری زندگی کے گھر کی تلاش کر اور دنیوی زندگی سے تجھے جو حصّہ ملا ہے اسے بھی مت بھول"۔

اسلام کی نگاہوں میں دنیا و آخرت اتنے مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لئے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:۔ لیس منا من ترک دنیاہ الآخرۃ و آخرۃ لدنیاہ۔ "جس نے اپنی دنیا کو آخرت کے لئے اور آخرت کو دنیا کے لئے ترک کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

مذموم دنیا

وہ دنیا جسے انسان اپنا مقصودِ اصلی بنالے اور اسے راستے کی بجائے منزل سمجھ لے وہ اسلام کی نظروں میں مذموم ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ واعلموا انما الحیٰوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ و تفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال و الاولاد۔ (۲۱ حدید) "اور جان لو کہ دنیا کی زندگی محض ایک کھیل ہے اور دل کا بہلاوا ہے اور زینت حاصل کرنے اور آپس میں فخر کرنے اور ایک دوسرے پر مال اور اولاد میں بڑائی جتانے کا ذریعہ ہے۔"

آسائش اور تعیش

اسلام مال کو قیامِ معیشت کا ذریعہ قرار دیتا ہے اور دنیا کی جائز آسائشوں اور تعیشوں کو انسان کی فطری خواہش قرار دیتا ہے۔

۱۔ ولا تؤتوا السفھاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما (۵ نساء) "اور مال و متاع کو خدا نے تمہارے لئے قیام (معیشت) کا ذریعہ بنایا ہے پس ایسا نہ کرو کہ کم عقل آدمیوں کے حوالے کر دو۔"

۲۔ زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث (۱۴ ال عمران) "انسان کے لئے عورتیں، اولادیں، سونے اور چاندی کے ذخیروں میں، خوبصورت گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں دلفریبی اور پسندیدگی رکھ دی گئی ہے۔"

۳۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔ (۳۲ اعراف) "اے رسولؐ ان لوگوں سے کہہ دو کہ خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں۔"

معاشی نظریہ کے عناصر

اسلام جو معاشی نظریہ پیش کرتا ہے اس کے پس منظر میں مندرجہ ذیل عناصر کارفرما ہیں :-

مدارجِ معیشت کا فرق

اسلام کی رو سے مدارجِ معیشت کا فرق فطری اور ناگزیر ہے، کیونکہ اگر سارے انسان معیشت میں یکساں اور ہموار ہو جائیں تو اس طرح دنیا کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہ نظام تمدن کے لئے ضروری ہے کہ انسانوں میں مزدور، کسان، لوہار، بڑھئی، ڈاکٹر، انجینئر، معلم غرضکہ ہر پیشے کے لوگ موجود ہوں۔ اگر سب مساوی اور یکساں حالت میں ہوں گے تو مقابلہ اور ترقی کی راہیں بند ہو جائیں گی اور لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملے گا اور نتیجہ کے طور پر انسانی معاشرہ میں ایک نامسعود جمود پیدا ہو جائے گا اور دنیا سُونی ہو کر رہ جائے گی۔ قرآنِ مجید میں اس معیشتی تفاوت کو مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ وھو الذی جعلکم خلٰئف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما آتاکم ان ربک سریع العقاب وانه لغفور الرحیم (انعام ۱۶۵) "اور اسی نے تم میں سے ایک کو دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک دوسرے پر درجہ میں بلندی دی تاکہ جو کچھ تمھیں دیا ہے اُس میں تمھیں آزمائے۔ تمھارا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور یقیناً وہی بخشنے والا اور رحم کرنے والا بھی ہے۔"

اس آیت میں بتایا گیا کہ نسلِ انسانی میں جانشینی کا ایک سلسلہ جاری ہے، لوگ درجات کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں اور مدارجِ معیشت کی یہ پستی و بلندی آزمائش کیلئے ہے۔

نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیٰوۃ الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضا سخریا ورحمۃ ربك خیر مما یجمعون (۳۲ زخرف) "ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کردی ہے اور ایک کو دوسرے پر درجوں میں بلندی دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں"۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ معاشرہ ایک دوسرے سے خدمت لینے کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے، اسی لئے انسان مختلف پست و بلند درجات میں بٹے ہوئے ہیں لیکن چونکہ یہ درجات کا اختلاف ہے طبقات کا اختلاف نہیں ہے اس لئے معیشت میں تفاوت ہونے کے باوجود انسان استحقاقِ معیشت میں مساوی ہیں۔

استحقاقِ معیشت میں مساوات

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسب رزق میں خواہ انسان مساوی نہ ہوں لیکن اس رزق کے استعمال میں سب لوگ مساوی ہیں اس لئے کہ رزق انسان کا پیدائشی اور فطری حق ہے۔

۱۔ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقها (ہود) "اور زمین میں کوئی بھی ایسا جاندار نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو"۔

۲۔ ونزلنا من السماء ماء مبارکا فانبتنا بہ جنات وحب الحصید والنخل باسقات لها طلع نضید رزقا للعباد (۱۱-۱۴ ق) "اور ہم نے بادل سے برکت والا پانی اتارا ہے پھر اس کے ذریعہ سے ہم باغ اگاتے ہیں اور کاٹی جانے والی کھیتی کے دانے بھی اور لمبے لمبے کھجوروں کے درخت بھی جن میں پھلوں کے خوشے لگتے ہیں جو بہت گھنے اور کثرت سے ہوتے ہیں۔ ہم نے بندوں کو رزق دینے کے لئے ایسا کیا ہے"۔

۳۔ وجعل فیها رواسی من فوقها وبارك فیها وقدر فیها اقواتها

فی اربعة ایام سواء للسائلین (۱۰ حم سجدہ)

اور اس نے زمین کے اوپر پہاڑ بنائے ہیں اور اس میں بڑی برکت رکھی ہے، اور اس میں رہنے والوں کے لئے سامانِ معیشت کو اندازہ کے مطابق بنا دیا ہے، اور یہ سب کچھ چار فصلوں میں کیا ہے اور یہ (سامانِ معیشت) طلب گاروں کے لئے مساوی ہے۔

ان آیات نے بتایا کہ زمین اور اس میں پوشیدہ سارے وسائلِ معاش اس لئے ہیں کہ اللہ کے بندے ان سے اپنا رزق حاصل کریں، اور اس حصولِ رزق پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ یہ سارے طلب گاروں کے لئے مساوی ہے۔

۴۔ واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق فما الذین فضلوا برآدی رزقھم علی ماملکت ایمانھم فھم فیہ سواء افبنعمة اللہ یجحدون (۱، نحل)

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔ پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کو زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی زیر دستوں کو لوٹا دے۔ حالانکہ سب اس (روزی) میں برابر کے حقدار ہیں، کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے منکر ہیں؟

اس آیت میں زیر دستوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے ماتحت ہیں یا جنہوں نے دوسروں سے کام لے کر بہت دولت کے مالک بن جاتے ہیں۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ مدارجِ معیشت کا فرق فطری ہے، اس لئے کہ ہر انسان کی عقلی اور جسمانی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں اسی لئے وسائلِ معاش کے اکتساب میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مدارجِ معیشت مختلف ہیں تو ہر شخص کو مطمئن معاش کیسے ملے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن کے پاس زیادہ ہے وہ لوٹا دیں۔ لوٹا دیں کا لفظ بتاتا ہے

کہ یہ حق انھیں کا تھا، فرق یہ ہوا کہ دوسرے کے پاس آگیا ہے اس لئے اسے لوٹا دینا چاہیئے۔ اسے "لوٹا دیں" سے اس محنت کش طبقہ کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے جو سرمایہ دار کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے لیکن اسے پوری اجرت نہیں ملتی اس لئے جتنی اجرت سرمایہ دار غصب کر لیتا ہے وہ محنت کش کا حق ہے۔ اور اُسے لوٹایا جانا چاہیئے۔

اِنفاق اسلام نے غیر ضروری جمع مال کی ممانعت کی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انفاق پر زور دیا ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللّٰہ فبشرھم بعذاب الیم (۳۴ توبہ) "اور جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں صرف نہ کرتے ہوں انھیں عذابِ الیم کی بشارت دے دو۔" اس میں سبیل اللّٰہ ایک عام لفظ ہے جس سے اللّٰہ کی رضامندی تک پہونچانے والا ہر فعل مراد ہے خواہ وہ کسی مسلمان کی مالی مدد ہو یا سرحدوں کا دفاع ہو یا اسلامی معاشرہ کی ضروریات کی فراہمی ہو۔ اگر سبیل اللّٰہ کو ضرورت ہو اور انسان خرچ نہ کرے تو یقیناً عذابِ الیم کا مستحق ہوگا۔ انفاق کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہر رقم کو صرف کرنے کے لئے فرمایا ہے۔ ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (۲۱۹ بقرہ) "اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہو کہ جو ضرورت سے بچ جائے۔" اس آیت میں انفاق کی یہ حد بتائی گئی ہے کہ انسان ضرورت سے زیادہ ہر رقم کو اللّٰہ کی راہ میں خرچ کر سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان فاضل مال اللّٰہ کی راہ میں خرچ کر کے تہی دست ہو کر بیٹھ جائے۔ یہ دراصل انفاق کی آخری حد ہے ورنہ بہت سی آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مال کی جائز حدود میں جمع آوری غلط نہیں ہے۔

۱۔ الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنٰھم ینفقون (۳ بقرہ)

"جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے انفاق کرتے ہیں۔

۲ ۔ خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا (۱۰۳ توبہ)

"ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لو اور اس طرح ان اموال کو پاک و پاکیزہ کر دو۔"

۳ ۔ والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذٰلک قواما (۶۷ فرقان)

"وہ لوگ جو انفاق میں اسراف نہیں کرتے اور نہ بخل کرتے ہیں بلکہ درمیانی راہ پر ہیں۔"

۴ ۔ والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (۲۵ المعارج)

"اور جن کے اموال میں ایک معین حصہ سائل و محروم کا ہے۔"

پہلی اور دوسری آیت میں سارے اموال کا انفاق یا سب کو زکوٰۃ میں لے لینے کا حکم نہیں ہے بلکہ اموال میں سے کچھ کے لئے فرمایا گیا ہے، تیسری آیت یہ بتاتی ہے کہ اگر سب کا انفاق ضروری ہوتا تو درمیانی راہ پر رکھنے کا قول مہمل تھا۔ اور چوتھی آیت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر سب مال سائل و محروم کو دے دینا واجب ہوتا تو معین حصہ کی قید بیکار تھی۔

پابند انفرادی ملکیت

سرمایہ داری نظام میں انفرادی ملکیت بالکل آزاد ہے۔ اس کے برعکس اشتراکیت فرد کے لئے ملکیت کو ضروری نہیں سمجھتی۔ اسلام ان دونوں کے درمیان ایک معتدل راہ کا قائل ہے۔ وہ انسان کو انفرادی ملکیت کا حق دیتا ہے لیکن اس کی وسعتوں کو محدود کر کے تاکہ یہ حق اجتماعی مصالح کے لئے مُضر نہ ہو۔ اگر فرد اور اجتماع میں تصادم ہو جائے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اجتماعی ضروریات کو فرد کی ضرورت پر ترجیح دی جائے گی۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کو پابند کرنے کے لئے کسبِ معیشت کے بہت سے طریقوں کو ناجائز قرار دیا ہے اور وسائلِ پیداوار میں سے بہت سی چیزوں کو حکومتِ اسلامیہ اور عام مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت قرار دیا ہے۔

جس کا ذکر تفصیل سے آگے موجود ہے ۔

اس معتدل نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام کے فلسفۂ اجتماع میں انسان کی دو شخصیتیں ہیں ۔ ایک شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک فرد ہے اور اس کی کچھ انفرادی حاجات ہیں اور دوسری شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک معاشرہ کا رکن ہے جسے معاشرتی مصالح کی نگہداشت بھی کرنی ہے ۔

بے قید معیشت کا انکار

اسلام نے بے قید معیشت کو کسی صورت میں بھی پسند نہیں کرتا، قرآن مجید نے ماضی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کفار کا قول نقل کیا ہے ۔ قالوا یا شعیب أصلوٰتك تامرك ان نترك مایعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشوء انك لانت الحلیم الرشید ۔ (۸۷ ۔ ھود)

"انھوں نے کہا اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباء کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا یہ کہ ہمیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہیں کریں ؟ تمھیں ایک عقلمند اور سمجھ دار آدمی رہ گئے ہو۔"

اس آیت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سرمایہ داروں کی بے قید معیشت کی خواہش قدیم ہے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے مال یا کسب مال پر کسی قسم کی پابندی عائد کی جائے جبکہ اسلام عہد قدیم ہی سے اس بے قید معیشت پر پہرے بٹھاتا آیا ہے ۔ حضرت شعیب کی امت کو بھی آپ پر یہی اعتراض تھا، اسی قسم کی سرمایہ دار ذہنیتیں ہر عہد میں اسلام اور پیغمبروں کی مخالف رہیں ۔

سرمایہ دار طبقہ

اسلام سرمایہ دار یا طبقۂ اشرافیہ کو ہر ہدایت کا مخالف قرار دیتا ہے ۔ وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون وقالوا نحن اکثر اموالا واولادا وما نحن

بمعذبین (۳۵ ۔ ۳۴ سبا) " اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر (نبی) نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے مالداروں نے کہا کہ ہم تمھاری رسالت کے منکر ہیں اور کہا کہ ہم تم سے مال اور اولاد میں زیادہ ہیں اور ہم پر کبھی عذاب نازل نہیں ہوگا "

اِس آیت میں رسولؐ کے لئے ایک عام بات بیان کی گئی ہے ۔ اب چند رسولوں کی رسالت میں دولت مند طبقہ کا موقف بیان کیا گیا ہے ۔

۱ ۔ نوحؑ : فقال ملاء الذین کفروا من قومہ ما نرٰک الا بشرا مثلنا وما نرٰک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای وما نری لکم علینا من فضل بل نظنکم کاذبین (۲۷۔ ھود)

" اس پر ان بڑے لوگوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے انکار کیا تھا (نوحؑ سے) کہا ہم تجھے اپنے جیسے آدمی کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور نہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سوائے ان لوگوں کے جو سرسری نظر میں ہم میں سے حقیر ترین ہیں کسی نے پیروی کی ہو اور ہم اپنے اوپر تمھاری کوئی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ ہم تمھیں جھوٹا سمجھتے ہیں "

۲ ۔ ھودؑ : فقال الملاء من قومہ الذین کفروا وکذبوا بلقاء الاٰخرۃ واترفناھم فی الحیٰوۃ الدنیا ما ھذا الا بشر مثلکم (۳۳۔ مومنون) " اور اس رسول کی قوم میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا تھا اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تھی اور جن کو ہم نے زندگی میں مالدار بنایا ، ان کے سرداروں نے کہا یہ تو تمھارے جیسا ایک آدمی ہے "

۳ ۔ صالحؑ : قال الملاء الذین استکبروا من قومہ للذین استضعفوا لمن آمن منھم أ تعلمون ان صالحا مرسل من ربہ قال الذین

استکبروا انا بالذی آمنتم به کافرون (۷۶۔ اعراف) "اس کی قوم میں سے جن بڑوں نے تکبر کیا تھا ان لوگوں سے جو صالحؑ کی قوم میں مومن تھے مگر ضعیف تھے انھوں نے کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کی طرف سے رسول ہے؟ ـــ وہ لوگ جنھوں نے تکبر سے کام لیا تھا بولے جس پر تم ایمان لائے ہو ہم اس کے منکر ہیں"۔

۴۔ شعیبؑ : قال الملاء الذین استکبروا من قومه لنخرجنك یاشعیب والذین آمنوا معك من قریتنا (۸۸ اعراف) " اس کی قوم میں سے جو متکبر ہوئے تھے ان میں سے بڑے لوگوں نے کہا اے شعیب ہم تم کو اور تمھارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے ملک سے نکال دیں گے"۔

۵۔ موسیٰؑ و ہارونؑ : فاستکبروا وکانوا قوما عالین فقالوا أنؤمن لبشرین مثلنا وقومهما لنا عابدین (۴۶۔ مومنون) "پس انھوں نے تکبر کیا اور سرکش لوگوں میں سے ہو گئے پھر انھوں نے کہا کیا ہم اپنے جیسے دو انسانوں پر ایمان لائیں؟ حالانکہ ان دونوں کی قوم ہماری غلامی کر رہی ہے"۔

۶۔ رسولِ اسلام : وَذَرنی والمکذبین اولی النعمة ومهلهم قلیلا (۱۲۔ مزمل) "اور اے رسولؐ! مالدار منکروں کو اور مجھ کو اکیلا چھوڑ دو اور تم ان کو کچھ ڈھیل دے دو"۔

معاشرہ اور ملک کی تباہی کے اسباب

اس سلسلہ میں اسلام نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے واذا اردنا ان نهلك قریة [illegible] امرنا مترفیها ففسقوا فیها فحق علیها القول فدمرناها تدمیرا (۱۶۔ بنی اسرائیل) "اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک

کرنے کا ارادہ کریں تو ہم اس کے سرمایہ داروں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں جس پر وہ اس بستی میں نافرمانی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اس بستی کے متعلق ہمارا کلام پُورا ہو جاتا ہے اور ہم اسے پوری طرح تباہ کر دیتے ہیں"۔

اِسلام اپنے معاشرہ میں اس طبقہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس طبقہ کی دُو بڑی خصوصیات ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے پاس وسائل معاش کا غیر ضروری اکتناز و احتکار ہوتا ہے اور دوسری یہ کہ اس خصوصیت کی وجہ سے پست طبقات میں اس کی وجاہت و بزرگی مُسلّم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ معاشرہ میں اثر و نفوذ پیدا کر لیتا ہے۔ اِسلام ان دونوں خصوصیتوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

۱۔ غیر ضروری اکتناز کے لیے حکم ہوا کہ والذین یکنزون الذھب و الفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ (۳۴۔ توبہ) "جو لوگ سونے چاندی کا اکتناز کریں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کریں انھیں دردناک عذاب کی خبر سنا دو"۔

۲۔ وجاہت و بزرگی کا معیار بتایا گیا۔ یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثٰی وجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۱۳۔ حجرات) "لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہوں اور قبائل میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ بزرگ اور وجیہ وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے"۔

معاش کی اجتماعی ضمانت

اسلامی معاشرہ میں اور اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ ہر شخص کو اس کے مطمئن حالات اور وسائل معاش کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کے چند اہم نکات مندرجۂ ذیل ہیں۔

محنت کے مواقع حکومتِ اسلامیہ اپنے عوام کو محنت کے مواقع فراہم کرے گی اور انھیں روزگار فراہم کرے گی جیسا کہ امیر المومنین علی ابنِ ابی طالبؑ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے:۔ ایھا الناس ان لی علیکم حقا ولکم علی حق فاما حقکم علیّ فالنصیحۃ لکم وتوفیر فیئکم علیکم۔" لوگو! میرا کچھ حق تمہارے اوپر ہے اور تمہارا کچھ حق مجھ پر ہے۔ تو تمھارا کچھ حق مجھ پر ہے۔ تو تمھارا حق جو مجھ پر ہے وہ یہ ہے کہ میں تمھیں نصیحت کروں اور تمھاری "فئ" کو تمھارے ہی اوپر صرف کروں"۔ فئ خراج کا اور بیت المال کی آمدنیوں کا نام ہے اور ان کی توفیر کا مفہوم یہ ہے کہ پیداوار اور محنت کے وسائل عوام کے لئے مہیا کئے جائیں۔ اسی بات کو آپؑ نے جناب مالکِ اشترؒ کے عہدنامہ میں وضاحت سے بیان کیا ہے: ولیکن نظرک فی عمارۃ الارض ابلغ من نظرک فی استجلاب الخراج لان ذٰلک لا یدرک الا بالعمارۃ۔" تم خراج وصول کرنے سے زیادہ زمین کی آبادکاری پر نظر رکھو اس لئے کہ آبادکاری کے بغیر خراج میں زیادتی نہیں ہوتی"۔

پھر فرمایا ہے کہ: ومن طلب الخراج بغیر عمارۃ اخرب البلاد و اھلک العباد ولا یستقم امرہ الا قلیلا وانما یؤتی خراب الارض من اعواز اھلھا۔" جس نے آبادکاری کے بغیر خراج طلب کیا اس نے بستیوں کو خراب کیا اور عوام کو ہلاکت میں ڈالا اور اس کو بہت کم فائدہ ہوگا۔ زمین کی تباہی لوگوں کے

فقر اور پریشانی کے سبب ہوتی ہے ۔

غریبوں سے ٹیکس کی ممانعت

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے ارشاد فرمایا ہے : ولا تبیعن للناس فی الخراج کسوۃ الشتاء ولا الصیف ولا رزقا یاکلونہ ولا دابۃ یعلمون علیھا ۔

"خراج وصول کرنے کے لئے لوگوں کے جاڑے گرمی کے کپڑے ، ان کا سامانِ غذا ، اور ان کے وہ جانور وغیرہ ہرگز مت فروخت کروانا جن سے وہ کام لیتے ہیں"۔

مزید براں ارشاد فرمایا :۔ ولا تبیع لاحد منھم عرضا فی شئی من الخراج وانا امرنا ان ناخذ منھم بالعفو۔ "خراج کے لئے ان میں سے کسی کے گھر کا کوئی سامان فروخت نہ کروا دینا ، ہم اس بات پر مامور ہیں کہ ان سے نرمی اور مروت کے ساتھ خراج لیں ۔

انسدادِ گداگری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے : مسئلۃ الناس من الفواحش والفواحشۃ تباح عند الضرورت ۔

" لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا بُرے کاموں میں داخل ہے اور بُرے کام کی اجازت صرف انتہائی ضرورت کی صورت میں ہوتی ہے "۔ حضرت رسول خداؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شھادۃ الذی یسئل فخر کفہ ترد ۔ " بھیک مانگنے والے کی گواہی رد کر دی جائیگی "

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے ۔ شیعتنا من لا یسئل الناس ولو مات جوعا۔ "ہمارا شیعہ وہ ہے جو بھوکا مر جائے لیکن دستِ سوال دراز نہ کرے "۔

اِسلام نے گداگری کو حرام قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ واما السائل فلا تنھر (الضحیٰ) " اگر سائل مانگ ہی لے تو اُسے جھڑکو مت "۔

یہ عزتِ نفس کی اعلیٰ مثال ہے ، یعنی کسی انسان کے آگے ہاتھ پھیلانا اپنی توہین کرنا ہے اور اگر کوئی شخص ہاتھ پھیلا دے اور دوسرا اسے جھڑک دے تو اس سے مانگنے والے کی انسانیت

دوسری بار مجروح ہوئی، اس لئے جھڑکنے سے منع کیا گیا ہے۔

گداگری سے منع کرنے کے بعد اسلام نے یہ طے کیا ہے کہ جو شخص محنت سے معذور ہو۔ نہ اس کے پاس ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لئے مال ہو اور نہ کوئی ایسا شخص ہو جو اس کی مدد کر سکے تو ایسی صورت میں حکومت اس کے اخراجات کا بوجھ برداشت کریگی۔

نفقہ

اسلامی معاشرہ میں بعض افراد کا نفقہ بعض کے ذمہ واجب قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی معاشی ضمانت ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔ باپ :- وہ اپنی اولاد اور ان کی اولاد کے نفقات کا ذمہ دار ہوگا خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، یہ اس وقت ہوگا جبکہ وہ فقیر ہوں اور کسب سے معذور ہوں اور اگر خود باپ انھیں نفقہ دینے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

۲۔ لڑکا :- وہ اپنے ماں باپ اور ان کے آباء و اُمہات کے نفقات کا ذمہ دار ہوگا۔ اس میں بھی مذکورۂ بالا شرائط مدِ نظر ہوں گی۔

۳۔ شوہر :- اپنی زوجہ کے نفقات کا ذمہ دار ہوگا۔

نفقہ کی تفصیلات :-

۱۔ گھر اور اس کی ضروری اشیاء۔

۲۔ گرمی اور جاڑے وغیرہ کے لباس۔

۳۔ بقدرِ کفایت خوراک۔

اگر مکلف نفقات نہ دے تو حکومت اسے مجبور کرے گی اور ان کے نفقات کو پورا کرنے کے لئے اگر مکلف کے پاس ضرورت سے زیادہ سامان ہوگا تو اُسے فروخت کروادے گی، اور اگر مکلف ادائیگیٔ نفقہ سے مجبور ہوگا تو یہ ذمہ داری حکومت کی ہوگی کہ

ان اشخاص کا بندوبست کرے۔

زراعت

زمین کی شرعی حیثیت

۱۔ ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا (۲۹ بقرہ) " وہ وہی ہے جس ان تمام چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارے (فائدے) کے لئے پیدا کیا ہے"۔

۲۔ وجعلنا لکم فیھا معایش ومن لستم لہ برازقین (۲۰۔ حجر) "اور ہم نے تم کو اس زمین میں اور اس کو جسے تم رزق نہیں دیتے معیشت کا سامان دیا ہے"۔

۳۔ ولقد مکناکم فی الارض وجعلنا لکم فیھا معایش (۱۰ اعراف) "اور ہم نے تمھیں زمین میں طاقت بخشی اور اس میں تمہارے لئے معیشت کے سامان مقرر کئے"۔

مذکورہ بالا آیات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ :-

الف :- زمین اور اس کے وسائل پیداوار سب کے لئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس پر صرف کسی خاص طبقہ ہی کو حق دیا گیا ہو بلکہ اس کے برعکس ہر انسان اس میں حق رکھتا ہے۔

ب :- جب زمین اور اس کے وسائل پیداوار سب کے لئے ہیں تو ان سے انتفاع کا حق بھی سارے انسانوں کے لئے عام ہے۔ اسی مساوی حق اور عام حق انتفاع کی بنیادوں پر اسلام کا نظام زراعت استوار ہے۔

ذاتی زمین

احیاء موات سے زمین ذاتی ملکیت ہو جاتی ہے۔ ارضِ موات سے وہ مُردہ زمین مراد ہے جو خواہ پانی نہ ہونے کی وجہ یا سیم اور تھور وغیرہ کی وجہ یا سیلاب یا کسی اور دوسرے سبب سے کاشت کے قابل نہ رہی ہو اور احیاء کے

معنی یہ ہیں کہ زمین کو کاشت کے قابل بنالیا جائے ، جو شخص ایسی زمین کو کاشت کے قابل بنائے گا وہ اس کی ذاتی ملکیت ہوگی ۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے :۔ من احیاء مواتا فھی لہ' جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی لئے ہے ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ من ــــ أحیا ارضا میتہ فھی لہ قضاء من اللہ ورسولہ جس نے ــ ــــ مردہ زمین کو زندہ کیا تو وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم سے اس کے لئے ہے ۔

اِس اصول کے پیشِ نظر اگر کسان نے مردہ زمینوں کو زندہ کر لیا تو وہ ان کا مالک ہوگا اور اس کے محصولات بلا شرکتِ غیرے اس کی ملکیت ہوں گے ۔

اِس طریقۂ کار کے دو فائدے ہیں :۔

۱ ۔ زمین کی مفت تقسیم سے لوگوں میں کاشتکاری کا جذبہ بڑھ جائے گا ، اور لوگ زیادہ سے زیادہ اس کی آباد کاری کی طرف آمادہ ہوں گے نتیجے کے طور پر زمینیں بے کار نہ رہیں گی ۔

۲ ۔ جب زمین پر کاشتکاری کرنا ہی اس کی ملکیت کا سبب ہوگا تو پھر ایسا کون ہے جو محنت کرے اور اپنے لئے کاشتکاری کرنے کی بجائے دوسروں کے لئے کرے ، ایسی صورت میں زمیندارانہ نظام پنپ نہ سکے گا اور کسان اس کے مفاسد سے محفوظ رہیں گے ۔

زمین کا اجارہ اگر کسان کے پاس زمین نہ ہو تو وہ زمین کے مالک سے زراعت کرنے کا معاہدہ کرے گا اور مالک محصولات کی ایک معین مقدار اس کسان کے لئے مقرر کر گیا۔ اس معاہدہ کے وقوع پذیر ہونے کے مندرجہ ذیل شرائط ہیں :۔

۱ ۔ فریقین بالغ و عاقل اور صاحبِ اختیار ہوں ۔ اسلام نے اختیار دے کر

خصوصیت سے کسان کے وسیع تر حقوق کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ اسے مجبور کر کے صرف اپنی شرطیں نہ منوالی جائیں جس کے نتیجہ میں وہ فقط محنت کرنے کا آلہ بن کر رہ جائے۔

۲۔ زمین کی پیداوار دونوں کا مشترک حصہ ہو یعنی اگر زمین کی کل پیداوار دونوں میں سے کسی ایک کے لئے ہو تو درست نہیں ہوتا۔ یہ کسان کی محنت اور جدوجہد کے لئے سب سے بڑا تشویقی عامل ہے، اس لئے کہ محنت اور جدوجہد سے پیداوار میں اضافہ ہوگا اور یہ اس کے حصہ میں بھی اضافہ کا سبب بنے گا۔

۳۔ پیداوار کے حصوں میں تفریق نہ ہو یعنی وہ حصہ جو مالک یا کسان کے لئے معین ہوگا وہ پوری پیداوار سے ہوگا۔ اگر ایک کے لئے پیداوار کی ایک قسم سے اور دوسرے کے لئے دوسری قسم سے حصہ کی تعیین کی جائے گی تو یہ درست نہ ہوگا۔ اس لئے کہ پھر یہ عین ممکن ہوگا کہ کسان اپنی پوری محنت اسی پیداوار پر صرف کرے جس میں اس کا حصہ ہے یا مالک اسی پیداوار کے لئے ساری سہولتیں فراہم کرے جو اس کے حصہ سے متعلق ہے۔

۴۔ مالک اور کسان کا حصہ متعین ہوگا، مثلاً تہائی، چوتھائی وغیرہ۔

۵۔ کاشتکاری کی مدت معین ہوگی خواہ مہینوں اور برسوں کے حساب سے ہو یا فصلوں کے حساب سے۔

۶۔ زمین قابلِ کاشت ہو یا قابلِ کاشت بنائی جاسکتی ہو۔

۷۔ کاشت کی جانے والی شئے کی تعیین ضروری ہوگی۔

۸۔ اس رقبہ کی تعیین ضروری ہوگی جس میں کاشت کرنی ہے۔

۹۔ کاشت کے دیگر مصارف مالک کے ذمہ ہوں گے یا کسان کے؟ اس کی تعیین ضروری ہوگی۔

لگان! شیخ مرتضیٰ انصاری نے مکاسب میں تحریر کیا ہے کہ لیس الخراج قدر معین بل المناط فیہ ماتراضی فیہ السلطان ومستعمل الارض لان الخراج ھی اجرۃ الارض فینوط برضی الموجود المتاجر۔
"لگان کی کوئی معین مقدار نہیں ہے بلکہ یہ سلطان اور کاشتکاروں کی باہمی رضامندی سے طے ہوگی اس لئے کہ لگان زمین کی اجرت ہے اور اجرت مالک اور کرایہ دار کی رضامندی سے طے ہوتی ہے"۔

دنیا کے کسی بھی زرعی قانون میں لگان کا فیصلہ کاشتکار پر نہیں چھوڑا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس اسے ہمیشہ حکومت ہی طے کرتی ہے۔ اسلام نے حکومت اور کاشتکار دونوں کی تراضی کی شرط رکھ کر یہ بتلایا کہ دونوں ایک ہی سطح پر ہیں۔

اراضی مفتوحہ سابق کاشتکاروں کے لئے

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ والارض التی اخذت بخیل ورکاب فھی موقوفۃ متروکۃ فی ید یعمرھا ویحییھا لقوم علیھا علی قدر طاقتی من الخراج النصف أو الثلث أو الثلثین علی قدر مایکون لھم صالحا ولا نصیریھم۔" وہ زمین جو جنگ کے ذریعہ حاصل کی گئی ہو وہ وقف ہے اور اسی کے قبضہ میں چھوڑ دی جائے گی جو اسے آباد کئے ہوئے ہوں اور حاکم شرع ان کی استطاعت کے اعتبار سے نصف یا ثلث یا ثلثین خراج معین کرے گا جو کاشتکاروں کے لئے مناسب اور غیر مضر ہو۔

مکاسب میں شیخ انصاری نے تحریر فرمایا ہے کہ ممالکِ مفتوحہ کی مزروعہ اراضی تمام اہلِ اسلام کی ملکیت ہوں گی اور اس کی آمدنی تمام ملتِ مسلمہ کے مصالح میں صرف کی جائے گی۔ حاکم شرع کو اس میں کوئی حق نہ ہوگا نہ کم نہ زیادہ۔

حقوقِ کاشتکار

مذکورہ بالا بیانات سے اسلام میں کاشتکاری کی منزلت اور حیثیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ نے ان کاشتکاروں کے متعلق مفصل بیانات دیئے ہیں۔ ایک مقام پر کسانوں کے سلسلے میں مالکِ اشترؒ کو جو حکم نامہ صادر فرمایا ہے اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے:۔

" فان شکوا ثقلا او علة او انقطاع شرب او بالة او احالة ارض اغتمرها غرق او اجحف بها عطش خففت عنهم بما ترجو ان یصلح به امرهم ولا یثقلن علیک شئ خففت به المؤونة عنهم فانه ذخر یعودون به علیک فی عمارة بلادک وتزئین ولایتک مع استجلابک حسن ثناتهم۔"

" اور اگر وہ خراج کی زیادتی کی یا کسی ناگہانی آفت کی یا زمین کے سیراب نہ ہونے کی یا سیلاب یا خشک سالی کی شکایت کریں تو تم ان پر سے اتنا خراج کم کردو کہ ان کی حالت درست ہوجائے اور یہ تخفیف تمھیں گراں نہیں گزرنی چاہیئے اس لیے کہ یہ ایک ذخیرہ ہے جس کے ذریعہ کسان تمھارے علاقوں کی آبادکاری کریں گے۔ تمھارے شہروں کی تزئین کریں گے اور پھر تم ان کی مدح وثنا حاصل کروگے۔"

محنت

اجارہ پر دی جانے والی چیزوں کی دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ اشیاء : مثلاً موٹر، مکان، زمین وغیرہ۔

۲۔ محنت : یعنی انسان ایک اجرتِ معین کے عوض اپنی محنت اجارہ پر دیدے۔

محنت کی اقسام

اس کی دو قسمیں ہیں۔ جسمانی محنت اور ذہنی محنت۔

۱۔ جسمانی محنت : اس میں وقت کی تعیین ہوگی کہ فلاں کام اتنے گھنٹے یا اتنے دن میں ہونا چاہیئے اور اس کی اجرت اتنی ہوگی۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ کام کی تعیین کی جائے گی کہ فلاں کام کرنا ہے اور اس کی اجرت یہ ہوگی۔

۲۔ ذہنی محنت : جیسے عموماً دفتروں وغیرہ میں ہوتی ہے۔ اس میں کام کی نوعیت کا معین کرنا ضروری ہوگا۔ اسی طرح وقت کی تعیین بھی ضروری ہوگی کہ دن میں اتنے گھنٹے کام کرنا ہوگا۔

اجرت

یہ وہ قیمت ہے جو کام لینے والا، مزدور کو اس کے کام کے مقابل عطا کرتا ہے۔ یہ اجرت رقم اور سامان دونوں ہی شکلوں میں ہوسکتی ہے لیکن اس کی نوعیت، کمیت اور اوصاف کی تعیین ضروری ہوگی۔

استحقاقِ اجرت

کام پورا کرنے کی صورت میں مزدور اجرت کا مستحق ہوگا۔ اور اگر وہ کام کرنے کے لئے آمادہ ہو اور کام لینے والے کی طرف سے ایسی صورت پیش آجائے کہ کام پورا نہ ہوسکے تب بھی مزدور پوری اجرت کا مستحق ہوگا۔

شرائط

اجرت پر کام کرنا درحقیقت کام لینے والے اور کام کرنے والے کے

درمیان ایک قسم کا معاہدہ ہے جس کی شرائط حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ فریقین بالغ و عاقل ہوں ۔

۲۔ صاحبِ اختیار ہوں اور اجارہ پر راضی ہوں ۔

۳۔ منفعت اور عوض کے مالک ہوں یا مالک کے نائب یا ولی ہوں ۔

حرام محنتیں

اہم ترین حرام محنتیں مندرجۂ ذیل ہیں :-

۱۔ وہ محنتیں جن سے غیر شرعی نتائج حاصل ہوتے ہیں جیسے شراب کشید کرنا (اسی طرح کشید یا فروختِ شراب کے لئے مکان کو اجرت پر دینا یا لینا ، یا حرام مقصد کے لئے موٹر وغیرہ کا کرایہ پر دینا یا لینا)

۲۔ مجسمہ سازی ۔

۳۔ ذی روح اشیاء کی ایسی نقاشی جس میں تجسیم ہو۔

۴۔ ایسی چیزوں کی پیداوار جو اغراضِ حرام میں صرف ہوں مثلاً فلمیں ، گراموفون ، آلاتِ لہو ، آلاتِ قمار وغیرہ ۔

۵۔ آرائشِ حسن ۔

۶۔ سحر ، شعبدہ اور کہانت وغیرہ ۔

۷۔ غنا ۔

مزدور کے حقوق

ایک مزدور کے چند اہم حقوق مندرجۂ ذیل ہیں :-

۱۔ **آزادی** :- مزدور کو اسلامی معاشرے میں آزادیٔ پیشہ ، آزادیٔ معاہدہ ، آزادیٔ مکان ، اور آزادیٔ رائے حاصل ہوگی ۔ وہ آزاد ہوگا کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے ، جس انسان یا جس کمپنی کے ساتھ چاہے کام کرے ، جس جگہ چاہے کام کرے اور اسے یہ حق

بھی حاصل ہوگا کہ اپنے نظریات کا اظہار کرے اور غلط باتوں پر تنقید کرے، اس قاعدہ کی بنیاد وہ شخصی آزادی ہے جو اسلامی معاشرے میں ہر فرد کو حاصل ہوگی۔

۲۔ **معین اوقاتِ کار:** مزدور کو مقررہ وقت سے زیادہ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر وہ اپنے ارادہ سے زیادہ کام کرے تب بھی اس مقدار کی اجرت واجب الادا ہوگی۔ اسی طرح مزدور کو اپنی استطاعت اور طاقت سے زیادہ کام نہیں کرنا ہوگا اور اگر زیادہ کام اس کی ہلاکت کا باعث ہو تو ایسی صورت میں زیادہ کام کرنا حرام ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اجتھدوا فی ان یکون زمانکم اربع ساعات ساعۃ لمناجات اللہ و ساعۃ لامر المعاش وساعۃ لمعاشرۃ الاخوان والثقات الذین یعرفونکم عیوبکم ویخلصون لکم فی الباطن وساعۃ تخلون فیھا للذاتکم فی غیر محرم "کوشش کرو کہ تمھارے اوقاتِ کار چار حصّوں میں تقسیم ہوں۔ ایک عبادتِ الٰہی کے لئے، دوسرا کسبِ معاش کیلئے، تیسرا اپنے دوستوں اور ایسے قابلِ اعتماد انسانوں کے لئے جو تمھیں تمھارے عیوب بتلا سکیں اور مخلص ہوں، اور چوتھا اپنی جائز لذتوں کے لئے"۔

اگر انسان اپنے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں کو مندرجۂ بالا پروگرام کے مطابق تقسیم کرے تو اس کے اوقاتِ کار فقط چھ گھنٹے بنتے ہیں۔

۳۔ **اجرت کی تعیین:** امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یستعین امیر حتی یعلمه ما اجره۔ "جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ اس وقت تک کسی کو اجرت پر

نہ لے جب تک اس کی اجرت نہ معلوم کرلے"۔
فقہ اسلامی کی رو سے اجرت کی تعیین طرفین کی رضا سے ہوتی ہے۔

مزدور انجمنیں

اسلام نے مزدوروں کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا ہے۔ انھیں پوری آزادی ہے۔ ان کے استحصال سے منع کیا ہے، ان کے لئے مناسب اجرت کا حکم دیا ہے۔ ایسی صورت میں کسی ایسی انجمن کی تشکیل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی جو ان کے حقوق کا مطالبہ کرے یا ان کی طرف سے وکالت کرے۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کو مکمل شرعی آزادی ہے اس لئے اگر مزدور مل کر ایک ایسی انجمن تشکیل دے لیں جو ان کے مسائل پر غور کرنے اور کام لینے والوں اور مزدوروں کے درمیان واسطہ بن جائے تو یہ فعل ان کا جائز حق ہوگا۔

خدمت لینے والے کے حقوق

۱۔ اسے ہر اعتبار سے اس نگرانی کا حق حاصل ہے کہ مزدور صحیح کام کر رہا ہے یا نہیں۔

۲۔ مزدور کام کے سلسلے میں اس کی ہر بات کی اطاعت کرے گا۔ لیکن اگر اس کی کسی بات کی بجا آوری سے مزدور کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہو تو وہ اطاعت نہیں کرے گا۔

۳۔ مزدور پر ضروری ہوگا کہ وہ آلات یا مشینیں جن سے وہ کام کر رہا ہے۔ ان کی حفاظت کرے، اگر اس نے ان کی حفاظت میں غفلت برتی اور وہ تلف ہوگئیں یا انھیں نقصان پہونچا تو مزدور ان کا ضامن ہوگا اور اسے نقصان کی تلافی کرنی ہوگی۔

ملازمت کا مسئلہ

وہ کام جو واجب عینی یا کفائی ہے اس کی اجرت لینی حرام ہے۔ غیر اسلامی معاشرہ میں حکومت کا ایک عہدیدار

جو تنخواہ لیتا ہے وہ اپنی اس محنت کے عوض لیتا ہے جو مختلف شعبوں میں اس سے لی جارہی ہے۔ مثلاً وزارتِ تعلیم، وزارتِ صحت، شعبۂ امنِ عامہ وغیرہ لیکن اسلامی حکومت میں یہ محنت واجبِ عینی یا کفائی ہوگی، یعنی یا تو ہر فردِ مسلم پر واجب ہوگی یا بعض پر واجب ہوگی اور دوسروں سے ساقط ہوجائے گی۔ مثلاً جاہل ایک عالم پر یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اسے تعلیم دے، ایک مریض ایک ڈاکٹر پر اپنا حق رکھتا ہے کہ وہ اس کا علاج کرے۔ اسی طرح پورا معاشرہ پولیس اور فوج پر یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے اور پوری قوم حکومت پر یہ حق رکھتی ہے کہ وہ اس کے سارے امور کی نگہبانی کرے اور چونکہ ان حقوق کے مقابل جو فرائض ادا کرنے ہونگے وہ شرعاً واجب ہیں اس لئے ان فرائض کی ادائیگی پر کسی کو اجرت کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا مثلاً استاد کو یہ حق نہ ہوگا کہ اپنی تدریس کے مقابل حکومت سے اجرت طلب کرے یا فوجی کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ تحفظِ وطن کی اجرت طلب کرے۔ یہ صورت اس وقت ہوگی جبکہ عمل انھیں لوگوں پر موقوف ہو اور وہ واجبِ عینی یا واجبِ کفائی ہو جیسا کہ شیخ مرتضیٰ انصاری نے مسالک اور مجمع البرھان کے حوالے سے مکاسب میں تحریر کیا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ واجب اجتماعی امور میں کسی کو عمل کے مقابل اجرت کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا لیکن حکومت پر یہ واجب ہوگا کہ عاملین کی ضرورت اور حیثیت کے مطابق ان کی معاش کا بندوبست کرے تاکہ لوگ دل جمعی سے کام کرسکیں۔

دیگر اعمال کی اُجرت

حکومت واجب اعمال کے علاوہ دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے لئے اجرت پر جو کام لے گی ان کے چند بنیادی نکات یہ ہیں:-

۱۔ حکومت متوازن اور عادلانہ اجرت کے بغیر افرادِ قوم سے کوئی کام نہیں

لے سکتی۔

۲۔ حکومت کسی کام کے انجام دینے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کر سکتی۔

ایک علاقہ سے کچھ لوگ امیر المومنینؓ کے پاس آئے اور کہا کہ ان کے علاقہ میں ایک نہر تھی جو امتدادِ زمانہ سے بھر گئی ہے۔ اسے اگر پھر کھود دیا جائے تو ان کے علاقہ کے لئے بہت فائدہ مند ہوگی۔ اس کے بعد انھوں نے خواہش کی کہ امیر المومنینؓ اپنے عامل کو حکم دیں کہ وہ نہر کے کھودنے میں ان لوگوں سے کام لے۔ انھوں نے اسے قبول کیا اور اپنے عامل قرضہ بن کعب کو خط بھی تحریر کیا لیکن ان لوگوں سے جبریہ کام لینے پر راضی نہیں ہوئے حالانکہ وہ لوگ خود راضی تھے۔ آپؓ نے تحریر فرمایا کہ :-

" اما بعد فان قوما من اهل عملك اتونی فذكروا ان لهم نهر قد عفا و درس وانهم ان حفروه عمرت بلادهم وقووا على كل خراجهم وزاد فی المسلمين قبلهم وسألونی الكتاب اليك اتأخذهم بعملہ وتجمعهم لحفره والانفاق عليه ولست ارى ان اجبر احد على عمل يكرهه فادعهم اليك فان كان الامر فی النهر على ما وصفوا فمن احب ان يعمل فمره بالعمل والنهر لمن عمل دون من كرهه ولئن يعمروا ويقووا احب الىّ من ان يضعفوا والسلام "

" تمہاری عملداری کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور انھوں نے بیان کیا کہ ان کی ایک نہر تھی جو بھر گئی ہے۔ اگر وہ اسے پھر کھود لیں تو ان کے علاقے سرسبز ہو جائیں گے اور وہ خراج کے بوجھ کو بآسانی اتار سکیں گے اور اس سے مسلمانوں کے اموال میں اضافہ ہوگا اور انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں تمھیں تحریر کر دوں

کہ تم انھیں اس کام پر مامور کرو اور انھیں اس کے کھودنے کے لئے جمع کرو، اور میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ تم ان میں سے کسی کو اس کام پر مجبور کرو جبکہ وہ راضی نہ ہو۔ تو تم انھیں اپنے پاس بلاؤ اور اگر صورتِ حال ایسی ہی ہو جیسی انھوں نے بیان کی ہے تو جوان میں سے کام کرنا چاہے تم اسے کام کا حکم دو اور نہر سے استفادہ وہی کرے گا جس نے کام کیا ہو جو اس پر راضی نہ تھا وہ استفادہ نہیں کرے گا۔ ان کی خوش حالی اور تقویت میرے نزدیک ان کے ضعف سے بہتر ہے۔ والسلام۔"

۳۔ صرف حکومت یا اس کے سربراہ ہی کو یہ حق ہوگا کہ وہ ان کے اخراجات کا ذمہ دار ہو سکے۔ وہ سماجی ضروریات حکومت کے گوشواروں اور اہلِ خبرہ (Experts) کے مشوروں کے بعد ان سے عہدہ برآ ہوگا۔

۴۔ یہ خدمتیں مسلمانوں پر مساوی اور عادلانہ طریقے سے تقسیم ہوں گی اور ان کی شخصی حیثیت یا ان کے اجتماعی نفوذ کو ان میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔

۱۔ تجارت

انسان ماضی کے بعید ترین ادوار سے تجارت میں مشغول ہے۔ شروع میں براہ راست تبادلہ (Barter System) کا طریقہ رائج رہا لیکن جیسے جیسے آلۂ مبادلہ تبدیل ہوتا گیا یعنی اشیاء کی جگہ سکّہ اور سکّہ کی جگہ زر کاغذ لیتا گیا ویسے ہی ویسے تجارتی امور میں فروغ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ آج تجارت مفکرین کی بحث و تحقیق کی جولانگاہ ہے۔ اس لئے کسی بھی ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملک کی معاشی زندگی اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

اسلام میں تجارت کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور انسان کو اس کی طرف مختلف طریقوں سے متوجہ کیا گیا ہے یہاں تک کہ اسے کسب معاش کے دوسرے وسائل پر ترجیح دی گئی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: لا یواجر نفسه ولکن یسترزق الله عزوجل ویتجر۔ انسان اجرت پر کام نہ کرے بلکہ اللہ سے رزق طلب کرے اور تجارت کو پیشہ بنائے۔

تجارت کا جو نظام اسلام نے دیا ہے اسے ایک تاجر کے لئے جاننا بہت ضروری قرار دیا ہے۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے فرمایا ہے:۔ من اتجر بغیر علم ارتطم فی الربا ثم ارتطم: "جس نے علم (تجارت اسلام) حاصل کئے بغیر تجارت کی وہ سود کی دلدل میں پھنس جائے گا۔"

مزید آپؑ نے فرمایا: من اراد التجارۃ فلیتفقه فی دینه لیعلم بذلك ما یحل له مما یحرم ومن لم یتفقه فی دینه ثم اتجر تورط فی الشبهات۔ "جو شخص تجارت کا ارادہ کرے اسے چاہیئے کہ وہ اپنے دین کا علم حاصل کرے تاکہ وہ اس کے ذریعہ حلال و حرام (معاملات) کو معلوم کرسکے اور اگر اس نے اپنے

دین کا علم حاصل نہ کیا اور تجارت کرنے لگا تو وہ شبہات میں بری طرح مبتلا ہو جائیگا۔

علم تجارت حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کو بازار میں بیٹھنے سے منع فرمایا ہے جو تجارت کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ لا یقعدن فی السوق الا من یعقل الشراء والبیع: جو لوگ خرید فروخت کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے وہ بازار میں نہ بیٹھیں۔

حد بندیاں

چونکہ تجارت میں فطری طور پر اجتماعی مفادات سے زیادہ ذاتی مفادات کی مدخلیت ہوتی ہے اس لئے اس کے نتیجہ کے طور پر تاجرانہ رقابت، منڈیوں پر چھا جانے کی کوشش، غیر فطری طریقوں سے اشیاء کی قیمت کو بڑھانے کی کوشش اور اسی قسم کے دوسرے اور بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے ان کے اسباب پر خاطر خواہ توجہ کی ہے اور خرید و فروخت میں ایسی حد بندیاں کر دی ہیں جن سے یہ مسائل پیدا نہ ہوں اور تجارتی فضا تاجر اور خریدار دونوں کے لئے سازگار رہے۔ ان حد بندیوں کا ایک اجمالی خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے اور اس پر مزید گفتگو بیع کے عنوان کے تحت ہوگی۔

احتکار

اس کے معنی یہ ہیں کہ اشیاء صرف کی قیمت بڑھنے کے انتظار میں بیچنے سے روک لیا جائے جبکہ مسلمانوں کو ان اشیاء کی ضرورت ہو اور کوئی ان کے ہاتھ فروخت کرنے والا نہ ہو۔ اسلام نے اس فعل کی انتہائی سخت ممانعت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ لئن یلقی اللہ العبد سارقا احب الیّ من ان یلقاہ قد احتکر طعاما اربعین یوما۔ "اگر اللہ کے سامنے کوئی بندہ چور بن کر جائے تو میرے نزدیک اس شخص سے بہتر ہے جو خدا کے سامنے اس حالت میں جائے کہ اس نے چالیس دن سامانِ غذا کا احتکار کیا ہو۔"

ایک دوسری روایت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے مروی ہے کہ ایما رجل اشتریٰ طعاما فکبسہ اربعین صباحا یرید بہ غلاء المسلمین ثم باعہ فتصدق بثمنہ لم یکن کفارۃ لما صنع ۔
" اگر کسی شخص نے سامانِ غذا خریدا اور اسے اس لئے چالیس دن تک ذخیرہ کیا کہ مسلمانوں میں مہنگائی بڑھ جائے تو بیچے، پھر اسے بیچ دیا اور اس کی پوری قیمت صدقہ کر دی تو یہ پوری قیمت بھی اس کے فعل احتکار کا کفّارہ نہیں ہوگی ۔

امیر المومنین علی ابنِ ابی طالبؑ نے مالک اشترؒ کو تحریر فرمایا تھا کہ :-
فامنع من الاحتکار فان رسول اللہ منع منہ ــــ فمن قارف حکرۃ من بعد نهیك ایاہ فنکل بہ وعاقبہ من غیر اسراف ۔
" تم تاجروں کو احتکار سے منع کرو اس لئے کہ رسول اللہؐ نے اس سے منع فرمایا ہے ــــ تو اگر منع کرنے کے باوجود کوئی شخص جرم احتکار کا مرتکب ہو تو تم اسے توبیخ کرو اور ایک مناسب سزا دو "

امیر المومنینؑ کے اس فرمان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ احتکار فقط ایسا گناہ نہیں ہے جس کی سزا قیامت کے دن ملے گی بلکہ اس فعل کی دنیا میں بھی سزا دی جائے گی اور اس حکم سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حکومتِ اسلامیہ براہِ راست تاجروں پر اس سلسلہ میں نگرانی رکھے گی ۔

غبن مال کو عام بازاری قیمت سے بہت مہنگا خریدنا یا بہت سستا بیچ دینا غبن ہے جبکہ پہلی صورت میں خریدار کو اور دوسری صورت میں تاجر کو مال کی عام بازاری قیمت نہ معلوم ہو ۔

اس کے حرام ہونے پر بھی متعدد روایات موجود ہیں ۔ ان میں ایک یہ ہے کہ غبن المؤمن حرام " مومن کو کم دینا حرام ہے " اور اگر ایسی صورت پیش

آجائے تو جسے نقصان ہوا ہے اسے اسلام معاملہ کے فسخ کرنے کا حکم دیتا ہے جسکی تفصیل خیارات کے ذیل میں بیان ہوگی۔

غش

خریدار سے مال کے عیب کو چھپانے کا نام غش ہے۔ اس کی حرمت پر بھی بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے: لیس منا من غش مسلما اوضرہ اوماکرہ۔ "جو کسی مسلمان کو دھوکا دے یا اسے نقصان پہونچائے یا اس سے فریب کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے"۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: ان البیع فی الظلال غش والغش لا یحل۔ "اندھیری جگہوں میں (جہاں مال کا عیب ظاہر نہ ہوسکے) بیچنا غش ہے اور غش (دھوکا دینا) جائز نہیں ہے"۔

ناپ تول میں کمی

خریدار کا مال کم تولنا یا کم ناپنا حرام ہے۔ اور اس سے بچنے کے لئے یہ مستحب قرار دیا گیا ہے کہ تاجر خریدار کو کچھ زیادہ ہی دیدے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اووزنوھم یخسرون۔ (۳-۲-۱ مطففین) "سودا سلف میں وزن کم کرنے والوں کے لئے عذاب ہے۔ جو تول کر لیتے ہیں تو خوب پورا کر کے لیتے ہیں، اور جب دوسروں کو تول کر دیتے ہیں تو وزن میں کمی کر دیتے ہیں"۔

ایک دوسرے مقام پر مذکور ہے: "فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ذلکم خیر لکم ان کنتم مؤمنین۔ (۸۵۔ اعراف)" تو تم ناپ تول دونوں پورے

پورے کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں حق سے کم نہ دیا کرو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو اگر تم مومن ہو۔"

سُودی کاروبار

سود کے سلسلے میں قرآن و احادیث میں بکثرت روایات و آیات موجود ہیں جن سے اس کی حرمت اور مضرت کا واضح تصور ہمارے سامنے آتا ہے اس پر تفصیلی بحث سود کے ذیل میں کی جائے گی۔ اس مقام پر صرف ایک آیت تحریر کی جاتی ہے: یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربا ان کنتم مؤمنین فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من اللہ و رسولہ و ان تبتم فلکم رءوس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔ (بقرہ ۲۷۸، ۲۷۹) "اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اگر تم مومن ہو تو سُود میں سے جو کچھ باقی ہو اُسے چھوڑ دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا یقین کر لو اور اگر تم سُود سے توبہ کر لو تو تمہارا سرمایہ تمہارے لئے وصول کرنا جائز ہے۔ نہ تم ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔

اشیاء کی قیمتوں کا توازن

ہر شئے کی دو قیمتیں ہوتی ہیں:-

۱۔ قیمتِ استعمال: انسان کسی چیز سے جو فائدہ حاصل کرتا ہے وہ فائدہ اس کی قیمتِ استعمال ہے، مثلاً روٹی پیٹ بھرنے کا فائدہ دیتی ہے تو یہی فائدہ اس کی قیمتِ استعمال ہے۔

۲۔ قیمتِ تبادلہ: کسی چیز کی وہ قیمت جو بازار میں تبادلہ کے وقت پیدا ہوتی ہے وہ قیمتِ تبادلہ کہلاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اگر ایک ٹوپی بناتا ہے تو اس کا مقصد اسے اپنے پاس رکھنا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا تبادلہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے

نزدیک اس ٹوپی کی قیمتِ استعمال کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

قیمتِ استعمال اور قیمتِ تبادلہ کا فرق خریدار اور تاجر کے نقطۂ نظر میں ایک فطری اختلاف پیدا کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خریدار ہمیشہ شے کو سستا خریدنا چاہتا ہے جبکہ تاجر کی مصلحت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ مہنگا بیچا جائے۔ اسی بنیاد پر دونوں کے درمیان سودے بازی ہوتی ہے اور پھر دونوں ایک قیمت پر راضی اور مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اس قیمت کا تعین تنہا طلب یا صرف رسد کی قوت سے نہیں ہوتا بلکہ اس پر طلب اور رسد دونوں ہی اثر انداز ہوتے ہیں، اور قیمت کی کمی اور زیادتی طلب اور رسد پر متضاد اثر ڈالتی ہے۔ قیمت کے کم ہونے کی صورت میں طلب بڑھتی ہے اور رسد کم ہوتی ہے اور قیمت کی زیادتی کی صورت میں طلب کم ہوجاتی ہے اور رسد بڑھتی ہے۔ طلبِ رسد کی کمی زیادتی ایک خاص منزل پر متوازن صورت اختیار کرلیتی ہے جس سے متوازن قیمت کا تعین ہوتا ہے اور اگر طلب و رسد کی قوتوں میں توازن نہ ہو تو قیمت بھی غیر متوازن ہوگی۔

قیمت کے غیر متوازن ہونے کے اور بھی بہت سے عوامل ہیں۔ مثلاً اشیاء کی ذخیرہ اندوزی یا اضافۂ قیمت کے لئے اشیاء کو ضائع کرنا یا ایک ہی شئے کے متعدد کارخانوں کے پیداواری تناسب اور اخراجات کا اختلاف وغیرہ۔

قیمتیں اگر مناسب و موزوں ہوں تو حکومتِ اسلامیہ کو نہ اس میں دخل دینے کا حق ہوگا اور نہ ضرورت ہوگی اس لئے کہ رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ الناس مسلطون علیٰ اموالھم" لوگ اپنے مال پر تسلط رکھتے ہیں یعنی جس طرح چاہیں فروخت کریں۔"

اور ایک دوسرے مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ" نرخ کا تقرر خدا کے ذمّہ ہے مگر جبکہ مال کا مالک حق سے بہت زیادہ قیمت مانگتا ہو تو اس کے ظلم و جور کی وجہ سے نرخ مقرر کردیا جائے گا۔ یعنی اگر قیمتوں میں اتنا اضافہ ہوگیا ہو کہ ایک عام انسان کیلئے

ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا دشوار ہو تو حکومت یہ دیکھے گی کہ یہ اضافہ کن اسباب کی بنا پر ہوا ہے۔ اور اگر ان اسباب کی پشت پر تجار کی زیادہ منفعت اندوزی کی سازش یا کوئی اور غیر شرعی وجہ ثابت ہوئی تو حکومت خود اشیاء کی قیمتوں کا متوازن تعین کرے گی اور تاجروں کو کم قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور کرے گی۔ اور اگر کسی جائز و شرعی سبب کی وجہ سے قیمتوں میں اتنا اضافہ ہو جائے کہ عام انسانوں کے لئے اشیاء کا حاصل کرنا مشکل ہو تو حکومت ان اسباب کا جائزہ لے کر انہیں دور کرنے کی سعی کرے گی اس لئے کہ حکومتِ اسلامیہ اپنی رعایا کے سارے انفرادی و اجتماعی حقوق کی ضامن ہے۔

حکومتِ اسلامیہ قیمتوں کے توازن پر خصوصیت سے نگرانی رکھے گی جیسا کہ امیر المومنینؑ کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے جناب مالک اشتر کو تحریر فرمایا ہے۔ ولیکن البیع سمحا بموازین عدل واسعار لا تجحف بالفریقین من البائع والمبتاع " اور ضروری ہے کہ فروخت نرم (اور وسعتِ قلب کے ساتھ) ہو اور پورے اور درست اوزان کے ساتھ ہو اور ایسی قیمتوں سے ہو جس سے تاجر اور خریداروں میں سے کسی کو نقصان نہ ہو۔

۲۔ تجارت

بیع | وہ معاہدہ ہے جس کے ذریعہ ایک شخص ایک معین معاوضہ کے بدلے کسی شئے کا مالک بنتا ہے۔

اقسام | بیع کی تین قسمیں جائز ہیں :۔

۱۔ بیع نقد : قیمت نقد دی جائے اور اسی وقت جنس بھی لے لی جائے۔

۲۔ بیع نسیہ : جنس لے لی جائے اور قیمت مدت کے بعد دی جائے۔

۳۔ بیع سلف : قیمت نقد دی جائے اور جنس تاخیر سے خریدنے والے کے سپرد کی جائے۔

بیع کے شرائط | خریدنے والے اور بیچنے والے میں مندرجۂ ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے :۔

۱۔ بالغ اور عاقل۔

۲۔ خرید و فروخت کا قصد رکھتے ہوں یعنی خرید و فروخت سہواً یا مزاحاً نہ ہو۔

۳۔ سفیہ نہ ہوں (سفیہ وہ شخص ہے جو اپنے مال کو موقع و محل سے صرف نہ کرتا ہو اور اپنے معاملات میں نفع و نقصان کا خیال نہ رکھتا ہو)

۴۔ بیچنے یا خریدنے پر مجبور نہ کئے گئے ہوں بلکہ مختار ہوں۔

۵۔ دونوں، اشیاء مبادلہ کے مالک ہوں یا مالک کے نائب یا ولی ہوں۔

اشیاءِ تبادلہ کے شرائط | ۱۔ وہ اشیاء انسان کی ملکیت بننے کی صلاحیت

رکھتی ہوں۔

۲۔ تاجر شئے کے سپرد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، مثلاً سمندر کی مچھلیاں یا فضا کے پرندے یا گم شدہ مویشی وغیرہ سپرد نہیں کئے جا سکتے۔

۳۔ شئے کی مقدار یا اس کا وزن اور اس کے اوصاف معلوم و معین ہوں۔

۴۔ شئے کے ہر اس وصف کی تعیین ضروری ہوگی جس کی وجہ سے لوگوں کے میلان میں فرق آتا ہو اور اس کے سبب سے قیمتوں میں فرق پیدا ہوتا ہو۔

خیارات

خریدار اور تاجر کو مندرجۂ ذیل صورتوں میں معاملہ کو ختم کر دینے کا اختیار ہے۔ اسے خیار کہا جاتا ہے۔

۱۔ خیارِ مجلس: جس جگہ خرید و فروخت ہوئی ہے، اگر طرفین وہیں پر موجود ہیں اور ابھی ہٹے نہیں ہیں تو دونوں کو حقِ فسخ ہے۔

۲۔ خیارِ غبن: اگر بہت مہنگا خرید لیا ہے یا مال بہت کم قیمت پر فروخت کر دیا ہے تو طرفین سے جس کو نقصان ہوا ہے اسے حقِ فسخ ہے۔

۳۔ خیارِ شرط: اگر معاملہ میں یہ شرط ہو کہ اتنی مدت تک دونوں کو یا ایک کو حقِ فسخ ہوگا تو طرفین اس شرط کی بناء پر معاملہ کو ختم کر سکتے ہیں۔

۴۔ خیارِ تدلیس: بیچنے والا اپنی جنس کو یا خریدار اپنے عوض کو اس سے بہتر بنا کر دکھائے جو حقیقت میں ہے اور اس کی وجہ سے قیمت میں بھی اختلاف ہو جاتا ہو تو پھر ایسی صورت میں دوسرے فریق کو اختیار ہوگا کہ وہ معاملہ ختم کر دے۔

۵۔ خیارِ تخلفِ شرط: خریدار یا تاجر کسی کام کے انجام دینے کی بھی شرط کرے یا یہ شرط کرے کہ مال فلاں قسم کا ہوگا اور اس پر عمل نہ کرے تو دوسرے فریق کو حقِ فسخ ہے۔

۶۔ خیارِ عیب : اگر جنس میں یا اس کے عوض میں کوئی عیب نظر آئے تو جنس کے عیب کی صورت میں فسخ کا حق خریدار کو اور عوض کے عیب کی صورت میں فسخ کا حق تاجر کو ہوگا۔

۷۔ خیارِ شرکت : جب معلوم ہو جائے کہ فروخت شدہ جنس کی کچھ مقدار کسی دوسرے کی ملک تھی تو اس مقدار کا مالک اس مقدار کی بیع میں اجازت دیدے تو درست اور اگر نہ دے تو خریدار کو اختیار ہے کہ سارے معاملے کو ختم کردے یا اس مقدار کی قیمت تاجر سے واپس لے لے۔ اسی طرح اگر معلوم ہو جائے کہ وہ عوض جو جنس کے مقابل دیا گیا ہے اس کی کچھ مقدار کسی دوسرے کی ملکیت ہے اور اس مقدار کا مالک اس معاملہ پر راضی نہیں ہے تو اس وقت بیچنے والے کو اختیار ہے کہ سارے معاملہ کو فسخ کردے یا اتنا عوض خریدار سے دوبارہ لے لے۔

۸۔ خیارِ رؤیت : اگر خریدار نے جنس کو دیکھے بغیر صرف اوصاف سن کر خرید لیا ہو اور خریدنے کے بعد اسے اس وصف کے خلاف پایا ہو تو خریدار کو حقِ فسخ ہے۔ اسی طرح اگر خریدار کے عوض میں یہی صورت پیدا ہو جائے تو بیچنے والے کو حقِ فسخ ہوگا۔

۹۔ خیارِ تاخیر : اگر خریدار نقد خرید کردہ جنس کی قیمت تین دن تک ادا نہ کرنے والا اور بیچنے والا بھی تین دن تک خریدار کو جنس نہ دے اور خریدار نے یہ شرط بھی نہ کی ہو کہ وہ عوض کے دینے میں تین دن تک تاخیر کر سکتا ہے۔ تو ایسی صورت میں بیچنے والے کو اختیار ہے کہ اس معاملہ کو فسخ کردے لیکن اگر جنس ایسی ہو کہ ایک دن رہنے سے بھی خراب ہو جاتی ہو جیسے بعض میوے تو اگر رات تک خریدار اس کا عوض نہ لے آئے اور اس نے یہ شرط بھی نہ کی ہو کہ

عوض دینے میں تاخیر کرسکتا ہے تو ایسی صورت میں بیچنے والا اسی رات کو معاملہ فسخ کرسکتا ہے۔

۱۰۔ خیارِ حیوان: اگر کوئی شخص حیوان خریدے تو خریدنے کے وقت سے تین دن تک اسے معاملہ کو ختم کردینے کا اختیار ہے اور اگر خریدار نے بھی معاوضہ میں جانور بیچ دیا ہو تو پھر بیچنے والے کو بھی تین دن تک معاملہ کے فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔

۱۱۔ خیارِ تعذرِ تسلیم: جب بیچنے والا اس چیز کو جسے فروخت کر رہا ہے نہ دے سکتا ہو مثلاً گائے فروخت کرے اور وہ بھاگ گئی ہو تو ایسی صورت میں خریدار کو اختیار ہے کہ اس معاملہ کو فسخ کردے۔

حرام خرید و فروخت

اسلام کا نظامِ تجارت دوسرے نظاموں سے اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ دوسرے نظاموں میں خرید و فروخت کی دینی، اخلاقی اور سماجی حیثیت پر نگاہ نہیں کی گئی، اس کے برعکس اسلام نے ان زاویوں پر بھی مکمل توجہ دی ہے اور ہر اس چیز کی خرید و فروخت حرام قرار دی ہے جو کسی بھی زاویہ سے انسان کی انفرادی یا اجتماعی حیثیت کے لئے مضر ہے۔ اسلام میں مندرجۂ ذیل اشیاء کی خرید و فروخت حرام ہے:۔

۱۔ عینِ نجس کی خرید و فروخت جیسے فضلہ وغیرہ۔

۲۔ غصبی مال کی خرید و فروخت۔

۳۔ ان چیزوں کی خرید و فروخت جو مال نہیں ہیں، جیسے درندہ۔

۴۔ ان چیزوں کی خرید و فروخت جو مخربِ اخلاق ہوں اور انسان کی بے حیائی کا سبب یا اس کے حرام میں مبتلا ہو جانے کا سبب بنیں، جیسے مسکرات، فلمیں،

ننگی تصویریں یا ایسے جرائد و مجلات جو بداخلاقی کا سبب ہوں وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ وہ خرید و فروخت جس میں سُود ہو۔

۶۔ ملاوٹ والی اشیاء کی خرید و فروخت۔

۷۔ وہ اشیاء جو اسلامی حکومت کے لئے ضرر رساں ہو مثلاً دشمن کے ہاتھ اسلحہ یا ایسی چیزیں فروخت کرنا جن سے دشمن کسی بھی اعتبار سے مضبوط ہو کر حملہ آور ہو سکے۔

۸۔ ایسی کتابوں اور پرچوں وغیرہ کی خرید و فروخت جو اسلامی عقیدہ کے خلاف ہوں اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کے ذہنوں کو گمراہ کر دیں۔ ایسی چیزیں مذکورہ بالا صفت کے مسلمان نہیں خرید سکتے۔

بین الاقوامی تجارت

بین الاقوامی تجارت سلسلۂ معاش کی ایک ناگزیر کڑی ہے۔ اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دنیا کے تمام خطوں کی زمین کا مزاج ایک جیسا نہیں ہے اور نہ آب و ہوا یکساں ہے۔ اسی وجہ سے مختلف علاقوں سے مختلف چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ جو چیز جس خطہ میں زیادہ پائی جائے گی اس جگہ سستی ہوگی اس لئے وہاں سے دوسرے علاقوں کو برآمد کی جائے گی اور جو چیز جس جگہ کم ہوگی وہ دوسرے علاقوں سے منگوائی جائے گی۔ اس اضافی احتیاج پر بین الاقوامی تجارت کی بنیادیں استوار ہیں۔

دنیا کے سارے ملکوں کی طرح اسلامی مملکت بھی بین الاقوامی تجارت سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ قرآن مجید میں اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ اللہ انسانوں کا زمین میں پھیل کر رزق تلاش کرنا اور بحری تجارتوں پر نکلنا پسند کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی

الارض وابتغوا من فضل اللّٰہ (۱۰۔ جمعہ) اور جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جایا کرو اور اللّٰہ کا فضل (معاش) تلاش کیا کرو۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے وترى الفلك مواخر فيه ولتبتغوا من فضله ولعلكم تشكرون (۱۴۔ النحل) تم اس میں کشتیوں کو پانی چیرتے دیکھتے ہو (جو اس لئے چلتی ہیں کہ تم سمندری سفر طے کرو) اور تاکہ تم اس کے فضل (رزق) کو تلاش کرو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

زمین میں پھیل کر اور سمندری سفر پر جا کر رزق تلاش کرنے کا بیان عام ہے جس میں دنیا کے تمام ممالک آجاتے ہیں۔

مملکتِ اسلامیہ کی بیرونی تجارت براہِ راست حکومت کی نگرانی میں ہوگی اور مالِ تجارت اس کی اجازت سے درآمد یا برآمد کیا جاسکے گا۔ اس کی نگرانی یا اجازت کا مقصد صرف یہ نہ ہوگا کہ درآمد و برآمد میں توازن قائم رکھ کر ملکی معیشت کو مضبوط بنایا جائے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ دین، اخلاق اور سماج کے مفادات کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ اس لئے کہ بعض حالات میں عین ممکن ہے کہ کسی چیز کا برآمد کرنا ملک یا قوم کیلئے نقصان دہ ہو یا کسی چیز کا درآمد کرنا دینی، اخلاقی یا ملکی و ملی مصالح کے خلاف ہو۔
حکومت ملکی کاروبار کی طرح غیر ملکی کاروبار میں بھی سود کے استعمال کو روا نہیں رکھے گی۔

سُود!

قرآنِ مجید میں سُود کی حُرمت پر بہت زور دیا گیا ہے اور متعدد آیات اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں جن میں سے صرف دو پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ الذین یاکلون الربا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربا واحل اللہ البیع وحرم الربا فمن جاءہ موعظۃ من ربہ فانتھیٰ فلہ ماسلف وامرہ الی اللہ ومن عاد فاولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون۔ یمحق اللہ الربا ویربی الصدقات واللہ لا یحب کل کفار اثیم۔ (۲۷۵ - ۲۷۶ - بقرہ) جو لوگ سُود کھاتے ہیں وہ اسی طرح (قیامت میں) کھڑے ہوں گے جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جس پر شیطان کا حملہ ہو، یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ فروخت بھی تو بالکل سُود کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے فروخت کو جائز قرار دیا ہے اور سُود کو حرام کیا ہے۔ اب جس کو اس کے پروردگار کی یہ نصیحت پہونچ گئی اور وہ آئندہ سُود لینے سے رک گیا تو جو کچھ پہلے وہ لے چکا ہے وہ اسی کا ہے اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے لیکن جو باز نہ آیا تو وہ تو دوزخی گروہ میں ہے۔ اللہ سُود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور ناسپاس و نافرمان لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن مجید میں خدا نے سُود خوار کو کہا ہے کہ وہ آسیب زدہ مخبوط انسان کی طرح قیامت کے دن کھڑا ہوگا اور اس کی سزا یہ بتلائی ہے کہ اس کی دولت کا وہ حصہ جو سود پر مشتمل ہوگا وہ برباد کر دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

۲۔ وما آتیتم من ربا لیربوا فی اموال النّاس فلا یربوا عند اللہ

وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون بہ وجہ اللہ فاولٰئک ھم المضعفون (۳۹۔ روم) اور جو روپیہ تم سود حاصل کرنے کے لئے دے رہے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مالوں میں بڑھے تو وہ روپیہ اللہ کے حضور نہیں بڑھتا، اور جو تم اللہ کی رضامندی کے لئے زکوٰۃ کے طور پر دیتے ہو تو یاد رکھو کہ اسی قسم کے لوگ روپیہ بڑھا رہے ہیں۔

قرآن مجید نے سود کی دو قسمیں بتلائی ہیں۔ ایک وہ سودی کاروبار جو غریبوں سے کیا جاتا ہے اور دوسرا جو تجارتی قرضوں پر ہوتا ہے۔ اس آیت میں اسی سودی کاروبار کا ذکر ہے جو مالداروں سے کیا جاتا ہے تاکہ مالدار اسے تجارت میں لگائیں اور روپیہ دینے والے کا روپیہ بھی بڑھے۔ یہ سودی کاروبار وہ ہے جس کے متعلق آج کی متمدن دنیا کا خیال ہے کہ تجارت یا صنعت و زراعت کے لئے سود پر قرض لینا اور دینا دونوں درست ہے۔ قرآن اسے بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ حرام قرار دیتا ہے۔ اس کی مذمت اور اس کے مفاسد پر مشتمل بہت سی روایات بھی پائی جاتی ہیں، امیرالمومنین علی ابن ابیطالبؑ فرماتے ہیں: لعن رسول اللہ الربا وآکلہ و بائعہ ومشتریہ وکاتبہ وشاھدیہ۔ رسول اللہؐ نے سود، سودخوار اس کے بیچنے والے، خریدنے والے، لکھنے والے اور گواہی دینے والے (سب پر) لعنت کی ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں اخبث المکاسب کسب الربا۔ وسائل معاش میں خبیث ترین وسیلہ سود ہے۔

متعدد روایات میں اس کے حرام ہونے کی مصلحتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سماعہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ میں نے قرآن میں دیکھا ہے کہ خداوند عالم نے اس کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ جانتے ہو ایسا کیوں ہے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں تو آپ نے فرمایا کہ اس کی حرمت کی تاکید کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنے سے نہ رک جائیں۔

اسی طرح ہشام بن حکم نے سُود کی حرمت کا سبب دریافت کیا تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر سود حلال کر دیا جاتا تو لوگ تجارت کو چھوڑ دیتے اور ان کاموں کو بھی ترک کر دیتے جن کی احتیاج رہتی ہے۔ اسی وجہ سے خدا نے سُود کو حرام کر دیا تاکہ لوگ حرام سے دُور بھاگیں اور تجارتوں کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

مفاسد

یہ وہ منحوس اور خبیث چیز ہے جس کی حرمت پر اسلام کو شدید اصرار ہے اور اس کی وجہ اس کے مفاسد ہیں جو فرد اور معاشرہ دونوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس کے چند مفاسد کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

۱۔ اخلاق باہمی تعاون کا درس دیتا ہے وہ دوسروں کی مدد کرنا سکھاتا ہے۔ اور جمع مال سے زیادہ انفاق کی رغبت دلاتا ہے، وہ حاجتمند کی حاجت روائی کو انسانیت کا ایک عظیم فرض سمجھتا ہے جبکہ سُود حاجتمند کا استحصال کرتا ہے۔ سودی کاروبار میں دوسروں کی مدد مرضیٔ الہٰی کے حصول کے لئے یا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر نہیں کی جاتی بلکہ کسب زر کے لئے کی جاتی ہے۔

سود پرور معاشرہ میں سیر چشم اور بے غرض انسان پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ معاشرے کی بنیاد ہی اگر کسب زر پر ہو تو اس میں مطلب پرست اور خود غرض انسانوں کے علاوہ اور کس قسم کے لوگ پرورش پا سکتے ہیں۔

۲۔ گزشتہ پچاس سال کے سیاسی حالات جن لوگوں کے سامنے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک نے ترقی پذیر ملکوں کو سود پر قرضے فراہم کر کے کس طرح مفادات کا استحصال کیا ہے اس اعتبار سے سُود ایک سیاسی جرم بھی ہے۔

۳۔ دنیا کے سارے معاملات تبادلہ پر قائم ہیں انسان کا پوری زندگی کا یہ طیرہ

رہتا ہے کہ وہ کچھ کھوتا ہے اور اس کے مقابل کچھ پاتا ہے۔ مثلاً اگر انسان اپنا مکان کسی کو کرایہ پر دے تو استعمال سے اس کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس میں فرسودگی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنی اراضی دولت میں سے کچھ کھوتا ہے اور اس کے مقابل کرایہ کی صورت میں نقدی کی دولت حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شخص جو اپنا سرمایہ دوسرے کو اس لئے دیتا ہے کہ وہ اسے کسی کام میں لگائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں، وہ بھی اپنی دولت کا ایک حصہ کھوتا ہے اس لئے کہ اگر اس کا کوئی شریک نہ ہوتا تو وہ سارے منافع کا حقدار ہوتا۔ اور اگر انسان کسی کو شریک نہ کرے خود ہی اپنے سرمایہ سے کاروبار کرے تو جو نفع ملے گا وہ اس کے سرمائے، اس کے وقت اور اسکی محنت کا بدلہ ہوگا۔ یعنی اس نے اپنے وقت اور محنت کو کھو کر نفع پایا۔ یہی قانونِ فطرت ہے اور اجتماعی زندگی کی بنیاد اسی پر استوار ہے۔ اس کے برعکس سودی کاروبار میں جو شخص کسی کو قرض دیتا ہے وہ ایک خاص مدت کے بعد اپنا اصل زر واپس لے لیتا ہے اور اس کی ذات یا صفات میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور سود اس کے علاوہ ملتا ہے، گویا قرض دینے والا خود کچھ نہیں کھوتا جبکہ قرضدار اس رقم کو کاروبار یا تجارت میں لگاتا ہے جہاں اسے وقت اور محنت کے صرف کے ساتھ ساتھ ان گنت حضرات پیش آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس طرح قوم کا ایک اقلیتی طبقہ صرف اپنی دولت کے بل بوتے پر مال و دولت کا ایک ڈھیر لگا لیتا ہے جبکہ اکثریت انتہائی محنت و مشقت کرتی ہے اور طرح طرح کے خطرات سے دوچار رہتی ہے۔

بینکاری

بینکاری اس دور کی اہمیت رکھنے والی ضرورتوں میں شامل ہے۔ اسلام اسے صرف اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ اس نظام کا پورا ڈھانچہ سود پر مبنی ہے۔ اگر سود نہ ہو تو یہ طریقہ اسلام کی نظروں میں درست ہوگا۔ زیر نظر بحث میں وہ خاکہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے جس کے ذریعے بینکاری کو اسلامی حدود میں لایا جا سکتا ہے ورنہ اسلامی معاشرہ میں اس کی جو صورت ہوگی وہ پیش کردہ صورت سے قدرے مختلف ہوگی جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

بینک جو خدمتیں انجام دیتا ہے ان میں اہم خدمات یہ ہیں :-

۱۔ قرضے

۱۔ قلیل المدت قرضے یا وہ قرضے جو انسان اپنی نجی ضروریات کے لئے لیتا ہے اس کی صورت یہ ہوگی کہ حاکم شرع بینکوں کو مجبور کرے گا کہ وہ اصحابِ حاجت کو بلا سود قرضہ دیں، اور قرضہ دینے کے لئے اپنے منافع میں سے ایک حصہ بطور سرمایہ مقرر کر دیں یا مقررہ مدت کے لئے جو رقوم بینک میں جمع کرائی جاتی ہیں ان میں سے قرض دیں۔ قرض کو ایک معینہ مدت میں ادا کرنا ہوگا اور اگر مقروض ادا کرنے سے قاصر رہا تو حکومت غارمین کے حصۂ زکوٰۃ سے ادا کرے گی۔

۲۔ قرضوں کی دوسری قسم وہ ہے جو کسی صنعتی، زراعتی، تجارتی یا پیداواری کام کے لئے دی جاتی ہے۔ یہ قسم اس لئے دی جاتی ہے کہ قرض لینے والا اسے کسی کام میں لگا کر نفع حاصل کرے۔ ایسے کام دو عناصر پر مبنی ہوتے ہیں۔ سرمایہ اور محنت۔ جدید بینکاری میں دونوں فریقوں کو منافع بینک کے توسط سے

ملتا ہے اور صورت یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ دار کو اس کے سرمایہ کے ہر سیکڑے کے حساب سے مقررشدہ منافع مل جاتا ہے اور باقی منافع بینک کا حق نکالنے کے بعد محنت کار کا ہو جاتا ہے۔ اگر محنت کار کو نقصان ہو جائے تو چونکہ بینک اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتا اس لئے نقصان بھی اس پر وارد نہیں ہوتا۔ اسی طرح سرمایہ دار پر بھی نقصان وارد نہیں ہوتا، بلکہ سرمایہ دار اتنی مدت تک سرمایہ رکھنے پر بھی منافع طلب کرتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ نقصان صرف محنت کار ہی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اسلام کا نظام بینکاری اس کے برعکس ہے اس لئے کہ وہ مضاربت کے اصول پر مبنی ہوگا۔ اسلام بینک کو ایک ایسا مالی ادارہ سمجھتا ہے جو امانتیں جمع کرنے والوں سے قرضوں اور امانتوں کی شکل میں مال حاصل کرتا ہے اور ان لوگوں کو دیتا ہے جو محنت کار ہوتے ہیں۔ اور اس مال کو پیداواری کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے بینک ایسا مالی ادارہ ہے جو سرمایہ دار اور صنعت کار کے درمیان وساطت کے فریضہ کی انجام دہی کرتا ہے اور صنعت کار سے جو منافع حاصل ہوتا ہے اس سے اپنا کمیشن حاصل کر لیتا ہے یہ کمیشن اس وساطت اور اقتصادی خدمت کا ہے جو بینک انجام دیتا ہے۔

بینکاری میں تین فریق ہوتے ہیں:۔

۱۔ محنت کش اور محنت کار۔

۲۔ سرمایہ کار

۳۔ بینک ـــــ یہ درحقیقت ایک ایسا واسطہ ہے جو مذکورۂ بالا دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ کبھی بینک محنت کار کو لوگوں کی جمع شدہ امانتوں کے علاوہ اپنے سرمایہ سے بھی رقم مہیا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں بینک کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک سرمایہ کار کی اور دوسری واسطہ کی۔

یہ تینوں فریق آپس میں مضاربت کے اصول پر ایک معاہدہ کریں گے، اور منافع اتفاق رائے سے طے ہوگا اور مضاربت کے طریقوں پر تقسیم ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کام میں نقصان ہوجائے تو مالی خسارہ صرف سرمایہ دار پر ہوگا محنت کار پر نہیں۔ اس لئے کہ محنت کار جو کہ منافع اور پیداوار میں شریک ہے اس نے اپنے حصہ کا نقصان برداشت کرلیا ہے اور وہ محنت اور وقت کا نقصان ہے۔ لہٰذا بینک یا سرمایہ کار اپنے حصہ کا نقصان اٹھائیں گے اور وہ سرمایہ کا نقصان ہوگا۔ (مضاربت کا مفہوم شرکتوں کی بحث میں بیان کیا گیا ہے)

۲ - ھُنڈی بینک جب ھُنڈی بھناتا ہے تو تاجر سے رقم مع سُود وصول کرلیتا ہے۔ یہ شرعاً درست نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ چالو کھاتوں یا عندالطلب کھاتوں کے سرمایہ سے بلاسُود ھُنڈیاں بھنائی جائیں۔

۳ - اِنتقالِ زر بینک کا ایک کام روپیہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی ہے۔ اس پر بینک جو منافع لیتا ہے وہ جائز ہے اِس لئے کہ وہ سُود کے حُدود میں نہیں آتا۔

۴ - اِعتماد نامے بینک مال کے پہونچ جانے کی صورت میں ادائیگی کی ضمانت لیتا ہے۔ اس کا منافع بھی شرعاً درست ہے۔

۵ - ایجنسی کی خدمات بینک اپنے گاہکوں کے لئے ایجنٹ کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیتا ہے اس کا معاوضہ بھی شرعاً جائز ہے۔

شرکتیں

شرکت کے معنی یہ ہیں کہ کچھ لوگ ملکیت میں شریک ہوں اور ان کے حصص آپس میں مخلوط ہوں۔ شرکت کے اسباب وعلل مختلف ہیں جن میں سے چند یہ ہیں :-

۱۔ کبھی ارث کی وجہ سے شرکت ہوتی ہے۔ مثلاً دو آدمی ایک ہی شئے کے وارث ہو جائیں۔

۲۔ کبھی شرکت عقد کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً دو آدمی ایک گھر کو عقدِ واحد سے خریدیں۔

۳۔ کبھی حیازت کی وجہ سے شرکت ہوتی ہے۔ مثلاً دو آدمی ایک زمین پر ایک ساتھ متصرف ہوں اور آپس میں مصالحت کرلیں۔

جن چیزوں میں شرکت ہوتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ کبھی شرکت اشیاء میں ہوتی ہے۔ مثلاً دو آدمی ایک شئے کے خریدنے میں شریک ہوں۔

۲۔ کبھی شرکت منفعت میں ہوتی ہے۔ مثلاً دو آدمی ایک گھر کو کرایہ پر لینے میں شریک ہوں۔

۳۔ کبھی شرکت حقوق میں ہوتی ہے۔ جیسے حقِ خیار یا حقِ شفعہ۔

شرکت کی دو قسمیں جائز ہیں :

۱۔ شرکتِ اموال۔

۲۔ شرکتِ مضاربت۔

شرکتِ اموال حدیث میں ہے کہ ان کان ربحا فھو بینھما وان کان نقصانا فعلیھما۔ اگر نفع ہو تو دونوں شریکوں میں تقسیم ہوگا۔

اور اگر نقصان ہو تو اس میں بھی دونوں شریک ہوں گے۔ اس شرکت کی رُو سے شرکین یا شرکاء اگر مال میں برابر کے شریک ہوں تو نفع و نقصان میں بھی مساوی ہوں گے۔ اور اگر مال میں تفاوت ہو تو ہر شخص کا نفع اس کے سرمایہ کے حساب سے ہوگا، اور نقصان کی تقسیم بھی اسی صورت سے ہوگی۔ فسخ اور تصرف میں بھی شرکین یا شرکاء مساوی ہوں گے۔ شرکاء میں سے کوئی بھی دیگر شرکاء کے اذن کے بغیر تصرف کا حقدار نہ ہوگا۔

شرکتِ مضاربت

یہ ایک ایسا شرعی معاہدہ ہے جس میں ایک انسان دوسرے کو اپنا مال اس لئے دیتا ہے کہ وہ اس سے تجارت کرے اور اس کے عوض معاوضہ کی ایک معین مقدار کا مستحق ہو جائے جو اتفاقِ رائے سے طے ہوتی ہے۔

اس میں دو فریق ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سرمایہ لگاتا ہے اور دوسرا وہ جو اپنی محنت لگاتا ہے۔ ان دونوں فریقوں کے درمیان منافع متفق شدہ طریقہ پر تقسیم ہوگا، اور نقصان کی صورت میں خسارہ صرف سرمایہ لگانے والے فریق پر وارد ہوگا۔ محنت کرنے والے پر نہیں۔

سرکاری مالیات

تمہید حکومتِ اسلامیہ ملکی انتظام، عوام کے جان و مال اور جائز حقوق کی حفاظت اور بین الاقوامی تعلقات وغیرہ کے علاوہ چند اور فرائض کی بھی ذمہ دار ہے جن میں عوام کی خوش حالی، ان کے مکمل روزگار کی ضمانت، فقر و فاقہ کی بیخ کنی، حفاظتی امور، تجارتی اور ترقیاتی امور زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تمام کاموں کے لئے حکومت بھاری اخراجات برداشت کرے گی۔ ان اخراجات کے لئے ایسی آمدنیوں کا

ہونا ناگزیر ہے جن سے یہ امور انجام پا سکیں۔ اس بارے میں حکومت اسلامیہ کے محصولات نیز اخراجات سے بحث کی جائے گی۔

حکومت کے ذرائع آمدنی

(۱) **ٹیکس** یہ حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسلام میں اہم ٹیکس زکوٰۃ، خمس اور جزیہ ہیں۔ ان کے علاوہ اسلامی حکومت اجتماعی حاجات و ضروریات کے تحت دوسرے ٹیکس بھی لگا سکتی ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ ان ٹیکسوں کی وصولیابی اور ان کا صرف حکومتِ شرعیہ کی صورت میں حاکمِ شرع کے حکم سے ہوتا اور اگر حکومتِ شرعیہ قائم نہ ہو تو استحقاق معلوم کر لینے کے بعد خود مسلمان حاکمِ شرع کی اجازت سے ٹیکس کی ان رقوم کو مستحقین میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ٹیکس کا مقصد

اسلامی معاشیات میں ٹیکسوں کے عائد کرنے کے دو مقصد ہیں:۔

۱۔ حکومتِ اسلامیہ کے اخراجات اور دیگر اجتماعی مفادات کے لئے مال جمع کیا جائے۔

۲۔ ثروتمند طبقوں سے غیر ضروری دولت نکل کر غریب طبقہ تک پہونچ جائے، یا مصالح عامہ میں صرف ہو جائے۔ اس اعتبار سے یہ ٹیکس اس بات کا فطری ذریعہ ہیں کہ معاشرہ کے کسی طبقہ میں بھی ضرورت سے زیادہ دولت جمع نہ ہو سکے۔ قرآن مجید میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ما افاء اللہ علیٰ رسول من اہل القریٰ فللّٰہ وللرسول والذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا (۸ حشر)

قریوں کے لوگوں کا جو مال اللہ نے اپنے رسولؐ کو عطا کیا ہے وہ اللہ اور رسولؐ اور قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا ہے تاکہ وہ تم میں کے سرمایہ داروں کے درمیان گردش نہ کرتا رہے ، اور رسولؐ جو کچھ تمہیں دیدے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو ۔

زکوٰۃ ، فطرہ اور قربانیاں ہر شخص سے متعلق ہیں ۔ ان کے علاوہ باقی سارے ٹیکس ان ثروتوں سے متعلق ہیں جو انسان کسب کرتا ہے اور جن سے کسی صورت میں مستغنی نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے جب تک انسان کسب کرتا رہے گا یہ ٹیکس وصول ہوتے رہیں گے اور اسلامی معاشرہ کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی ۔

زکوٰۃ ، خمس اور جزیہ پر مختصر تبصرہ

زکوٰۃ | زکوٰۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جس پر اسلام نے بہت زیادہ زور دیا ہے اور اسے فقر و فاقہ کے دفعیہ کا موثر ترین ذریعہ قرار دیا ہے ۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ " ان اللہ فرض علی الاغنیاء فی اموالھم بقدر ما یکفی فقراءھم فان جاعوا او عروا وجھدوا فبمنع الاغنیاء " اللہ نے سرمایہ داروں کے اموال میں غریبوں کا حق اتنا ہی واجب کیا ہے جتنا غریبوں کے لئے کافی ہے ، تو غریبوں کی بھوک ، برہنگی اور صعوبت کا سبب یہ ہوگا کہ سرمایہ دار حقوق ادا نہ کریں ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ : " ولو ان الناس ادوا زکوٰۃ اموالھم ما بقی مسلم فقیرا محتاجا ولاستغنیٰ بما فرض اللہ لہ وان الناس ما افتقروا ولا احتاجوا ولا جاعوا ولا عروا الا بذنوب الاغنیاء " اگر لوگ اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرتے تو کوئی مسلمان فقیر اور محتاج نہ رہتا اور خدا نے اس کیلئے جو حق رکھا ہے وہ اس کی وجہ سے مستغنی ہو جاتا ، لوگوں میں جو فقر ، احتیاج ، بھوک اور

برہنگی ہے وہ صرف سرمایہ داروں کے گناہوں (اسلام کے عائد کردہ حقوق نہ دینے) کی وجہ سے ہے۔

اس میں چند باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ زکوٰۃ صرف مالی ٹیکس نہیں ہے بلکہ عبادت بھی ہے اور فروعِ دین کے اہم ارکان میں ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر نماز کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ۔ "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔"

۲۔ زکوٰۃ غریبوں پر امراء کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی حق ہے جس کی جمع آوری شرعی حکومت کے ذمہ ہے اور اگر کوئی شخص زکوٰۃ دینے سے انکار کرے تو بالجبر وصول کی جائے گی۔

۳۔ ہر علاقے کی زکوٰۃ وہیں کے مصارف میں صَرف ہوگی اور اگر وہاں کے مصارف سے بچ جائے تو حاکمِ اعلیٰ کے مرکزی بیت المال میں جمع ہوگی اور سارے مسلمانوں کے مصالح میں صَرف ہوگی۔

۴۔ زکوٰۃ کے خرچ کی چند مخصوص مدیں ہیں اور اگر ان میں سے کوئی مد نہ ہو تو اس کا حصّہ دوسری مد میں ڈال دیا جائے گا۔

خُمس

خُمس آمدنیوں اور غنیمتوں کا پانچواں حصہ ہے۔ یہ دو بڑے حصّوں میں تقسیم ہوگا۔ آدھا بنی ہاشم کے لئے اور آدھا حاکمِ شرع کے لئے۔ آیات و روایات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حاکمِ شرع اس حصّہ سے اپنے اور دیگر ارکانِ حکومت کے اخراجات پورے کرے گا، نیز دینی و اجتماعی مصالح کے سلسلے میں جو اخراجات ہوں گے انھیں بھی اسی رقم سے پورا کیا جائے گا۔ اس پر تفصیلی گفتگو آگے آئے گی۔

جزیہ

"حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ (۲۹ سورۃ توبہ)
یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیدیں درانحالیکہ وہ محکوم ہوچکے ہوں"۔ یہ لفظ جزار سے نکلا ہے جس کے معنی بدلہ ہیں۔ ہاتھ سے جزیہ دینے کا مطلب خوشی سے دینا ہے۔ اسلام میں فوجی قانون (جہاد) واجب ہے۔ ہر شخص کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت کرے۔ حکومت میں بسنے والے ذمیّوں پر بھی ملک کی حفاظت ضروری ہے لیکن اسلام نے ان کے ساتھ جبر پسند نہیں کیا بلکہ اس کے عوض ایک سالانہ رقم معین کردی اور یہی جزیہ ہے۔ مزید یہ کہ مسلمان اور غیر ملکی رعایا دیگر سماجی حقوق میں تقریباً مساوی ہیں۔ مسلمانوں پر کئی قسم کے ٹیکس عائد ہوتے ہیں جبکہ غیر مسلم رعایا ان سے بری ہے۔ اس لئے ان پر جزیہ فرض کیا گیا ہے۔

وہ دولتیں جن پر اسلامی ٹیکس کا قانون نافذ ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **نقود:** یعنی سونے اور چاندی کے وہ سکّے جو خرید و فروخت اور لین دین کا آلہ ہوں۔ ایک مخصوص مقدار کے بعد ان پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ ان کو ملکیت میں آئے ہوئے ایک سال گزر چکا ہو۔

۲۔ **جانور:** یعنی اونٹ، گائے بھینس، اور بھیڑ بکریاں۔ ان پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب ان کی تعداد ایک مخصوص حد سے متجاوز ہوجائے اور انکو ملکیت میں آئے ہوئے ایک سال گذر چکا ہو (اس کے علاوہ وجوبِ زکوٰۃ کے اور بھی شرائط کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔

۳۔ **کاشت:** یعنی گیہوں، جَو، کھجور اور منقّیٰ، ان پر بھی ایک مخصوص مقدار سے متجاوز ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

۴۔ **معدنیات:** اِن میں ہر وہ چیز داخل ہے جو پہاڑوں سے نکالی جاتی ہو۔ مثلاً دھاتیں، سونا، چاندی، پیتل، لوہا وغیرہ یا پتھر جیسے فیروزہ، یاقوت،

پتھر کوئلہ وغیرہ یا سیال جیسے تیل، پارہ، شورہ اور ایسی ہی ہر وہ چیز جو زمین یا پہاڑوں سے نکالی جائے معدنیات میں شامل ہے۔ ان کے نکالنے کے مصارف کو خارج کرنے کے بعد ان میں خمس واجب ہے۔

۵۔ سمندری دولت یعنی ہر وہ شئے جو غواصی کے ذریعہ سمندر سے نکالی جائے مثلاً لؤلو، مرجان، عنبر اور مونگا وغیرہ۔ اس میں خمس واجب ہوگا۔

۶۔ حربی دولت جو جنگ حاکم شرع کے حکم سے کافروں سے لڑی جائے اس میں جو مال مسلمانوں کے ہاتھ آئے وہ غنیمت ہے۔ مثلاً اسلحہ، نقود یا اثاث البیت وغیرہ، اس پر خمس واجب ہوتا ہے۔

۷۔ تجارتی دولت۔ یعنی تجارت کا وہ منافع جو تاجر اور اس کے اہل وعیال کے سال کے اخراجات سے فاضل ہو اس پر خمس واجب ہوگا۔

۸۔ صنعتی دولت یعنی صنعت کا وہ منافع جو صنعت کار اور اس کے اہل وعیال کے ایک سال کے اخراجات سے فاضل ہو اس پر خمس ہوگا۔

۹۔ زراعتی دولت۔ یعنی زراعت کا وہ منافع جو زارع اور اس کے اہل وعیال کے ایک سال کے اخراجات سے فاضل ہو اس پر خمس واجب ہوگا۔

۱۰۔ ارضی دولت یعنی جو زمین کافر ذمّی ایک مسلمان سے خریدے اس پر خمس واجب ہوگا۔

۱۱۔ خزانہ۔ یعنی وہ مال جو درخت، پہاڑ یا دیوار یا زیر زمین چھپا ہوا ہو، اگر کسی مسلمان کے ہاتھ آئے اور اسے اس مال کے شرعی مالک کا پتہ نہ ہو تو وہ مال پانے والے کا ہوگا اور اس پر خمس واجب ہوگا۔

۱۲۔ مالِ مخلوط۔ وہ مال جس میں حلال وحرام دونوں مخلوط ہوں اس کا حکم یہ ہوگا کہ حلال وحرام کی اگر تعین وتشخص ہو سکے تو انھیں الگ کرکے

ان کے شرعی مالکوں تک پہونچایا جائے گا اور اگر مالِ حرام کی مقدار کی تعیین نہ ہو سکے یا اس کے مالکِ شرعی کا پتہ نہ چل سکے تو اس پر خمس واجب ہوگا۔

۱۳۔ **زکوٰۃ فطرہ** : عید الفطر کے موقع پر ہر بالغ آزاد اور صاحبِ مقدرت شخص پر اپنا اور اپنے اہل و عیال کا فطرہ نکالنا واجب ہے۔ فطرہ کی مقدار ایک صاع (تقریباً سوا تین سیر) گیہوں یا چاول یا کھجور وغیرہ ہے۔

۱۴۔ **فدیہ** : یہ وہ رقم ہے جو حاکمِ شرع جنگی قیدیوں سے طلب کرتا ہے تاکہ ٹیکس لے کر انھیں آزاد کر دیا جائے۔ اس کی کوئی مقدار معین نہیں ہے بلکہ یہ حاکمِ شرع کی صوابدید پر ہے۔

۱۵۔ **جزیہ** : یہ وہ ٹیکس ہے جو حاکمِ شرع حکومتِ اسلامی کے حدود میں یا اسلام کی پناہ داد حکومت میں بسنے والے ذمیوں پر ان کے افراد یا زمینوں کے اعتبار سے عائد کرتا ہے۔ اس کی مقدار کی تعیین بھی حاکمِ شرع کی صوابدید پر ہوگی۔

۱۶۔ **دفاعی ٹیکس** : اگر جنگی ضرورتیں درپیش ہوں تو ان کے لئے حکومتِ اسلامی کو حق ہوگا کہ وہ مسلمانوں سے ٹیکس وصول کرے۔ اس کا اشارہ اس آیت میں موجود ہے۔ واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم وما تنفقوا من شيء في سبيل الله يوف اليكم وانتم لا تظلمون (۶۰ انفال) اور تم ان (لڑنے والوں) کے لئے جس حد تک ممکن ہو اپنی طاقتیں جمع کرو اور گھوڑے تیار رکھو کہ اس طرح اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے نیز ان لوگوں کے

علاوہ اوروں پر بھی جن کی تمھیں خبر نہیں۔ اللہ انھیں جانتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں تم جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا پورا مل جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس ٹیکس کی مقدار بھی حاکمِ شرع کی صوابدید پر موقوف ہے۔

۱۷۔ **ھنگامی ٹیکس**: کبھی معاشرہ پر ناگہانی حالات بھی طاری ہوتے ہیں اور ایسی ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں جن میں مزید سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً سیلاب یا زلزلہ وغیرہ سے تباہ شدہ افراد کی امداد۔ تو اس صورت میں حاکمِ شرع حق رکھتا ہے کہ اس حاجت کو پورا کرنے کے لئے وقتی طور پر ایک ٹیکس لگا دے۔ اس صورتِ حال پر ہر وہ آیت دلالت کرتی ہے جس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کی راہ ہر وہ چیز ہے جس پر دین اور دینی ضروریات مبنی ہیں۔ اسلامی معاشرہ بھی دینی ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ اگر اس کی امداد یا تقویت کے لئے ضرورت ہو تو حاکمِ شرع مسلمانوں سے اس کے لئے امداد طلب کر سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل روایات سے بھی ان پر روشنی پڑتی ہے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ: الحق المعلوم الشیٔ یخرجه من ماله لیس من الزکوٰۃ ولا من صدقۃ المفروضتین فقال له الرجل فما یصنع به فقال یصل به رحما ویقوی به ضعیفا ویحمل به کلاً أو یصل به أخاً له فی اللہ۔ حق معلوم سے زکوٰۃ و صدقہ واجبہ مراد نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور ایسے اموال مراد ہیں جو انسان اپنے مال سے نکالے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اس مال کا کیا کرے؟ آپ نے فرمایا اس سے قرابتداروں سے صلۂ رحم کرے، کمزور کو قوی کرے،

کسی کا بوجھ بٹانے یا کسی برادرِ ایمانی کو مدد پہونچائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ولکن اللہ عزوجل فرض فی اموال الاغنیاء حقوقاً غیر الزکوٰۃ فقال عزمن قائل "والذین فی اموالھم حق معلوم السائل والمحروم" فالحق المعلوم غیر الزکوٰۃ وھو شیٔ یفرضہ الرجل علی نفسہ فی مالہ یجب علیہ ان یفرضہ علی قدر طاقتہ وسعۃ مالہ فیؤدی الذی فرض علی نفسہ ۔ لیکن خداوندِ عالم نے سرمایہ داروں کے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حق فرض کئے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے" اور جن کے اموال میں سائل اور محروم کا معین حق ہے"۔ یہ معین حق زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ اسے آدمی اپنے مال میں سے اپنے اوپر فرض کرتا ہے۔ اس پر واجب ہے کہ اپنی استطاعتِ مالی کو دیکھ کر فرض کرے اور پھر اس فرض شدہ رقم کو ادا کرے۔

سماعہ سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ قوم عندھم فضول وباخوانھم حاجۃ شدیدۃ ولیس تسعھم الزکوٰۃ أیسعھم أن یشبعوا ویجوع اخوانھم فان الزمان الشدید ، فقال علیہ السلام المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یخذلہ ولا یحرمہ فیحق علی المسلمین الاجتہاد فیہ والتواصل والتعاون والمواسات لاھل الحاجۃ والعطف منکم۔ ایک طبقہ کے پاس مال زیادہ ہے اور کچھ لوگ شدید احتیاج رکھتے ہیں انہیں زکوٰۃ سے پورا نہیں پڑتا تو کیا ناداروں کے لئے یہ جائز ہے وہ پیٹ بھر کے غذا کھائیں اور ان کے بھائی بھوکے رہیں اور مصیبتوں میں گرفتار رہیں ؟

آپؐ نے جواب دیا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے ، وہ نہ اس پر ظلم کر سکتا ہے اور نہ اسے مایوس و محروم کر سکتا ہے۔ مسلمانوں پر اہلِ حاجت کا یہ حق ہے کہ وہ اس پر شفقت کریں ، ان کی مدد کریں اور ان کے لئے کوشاں رہیں۔

مفضل ابنِ عمر سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ : ایما مؤمن حبس مومنا عن ماله وهو محتاج اليه لم يذقه الله من طعام الجنة ولا يشرب من الرحيق المختوم۔ اگر مومن نے کسی صاحبِ حاجت مومن پر اپنے مال کے دروازے بند کئے تو اللہ اسے جنت کے کھانوں کا ذائقہ بھی نہ چکھنے دے گا اور نہ اسے سربمہر جنتی مشروبات پلائے گا۔

مندرجۂ بالا روایات کے علاوہ اور بہت سی روایات ایسی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واجب حقوق یعنی خمس و زکوٰۃ وغیرہ کے علاوہ اور بھی کچھ حقوق ایسے ہیں جن کی ادائیگی ضروری ہے۔ شرعی حکومت مسلمانوں کے اجتماعی اور قومی و ملکی مصالح کے تحت ان کی جمع آوری کی مجاز ہوگی۔

(۲) اراضی اور دیگر قدرتی وسائل

وہ زمینیں یا دیگر قدرتی وسائل جو حکومت کی ملکیت ہوں گے یا حکومت کو جن میں تصرف کا حق حاصل ہوگا۔ مندرجۂ ذیل ہیں :

۱ ۔ وہ مفتوحہ زرعی زمینیں جن میں کاشت ہو رہی ہو۔

۲ ۔ بنجر اور غیر زرعی زمینیں۔

۳ ۔ ساحلِ بحر۔

۴ ۔ جنگلات اور جھاڑیاں۔

۵ ۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور وادیاں۔

۶ ۔ بادشاہوں کی اراضی۔

۷ ۔ معادن ۔

۸ ۔ سمندر، دریا اور نہریں ۔

مندرجۂ بالا چیزیں حکومت کے ذرائع آمدنی میں بہت اہمیت کی حامل ہیں ۔
ان میں بعض صورتوں میں اراضی حکومت کی ملکیت ہوں گی اوران کی آمدنی سماجی فلاح وبہبود پر خرچ کی جائے گی اور بعض میں وہ اراضی لوگوں کی ملکیت ہوں گی، لیکن ان کی آمدنی حاکمِ شرع کے تصرف میں ہوگی اور بعض صورتوں میں وہ اراضی عام مسلمانوں پر وقف ہوگی اوراس کی تولیت حکومت کے ذمہ ہوگی۔ ان کی تفصیل یہ ہے :۔

۱۔۲۔اراضی

یہ حکومت کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ ان پر حکومت کا تصرف فقط اس لئے نہیں ہوگا کہ وہ ان کی آمدنی سے اپنے اخراجات کو پورا کرلے بلکہ اس کے ساتھ دو مقاصد اور بھی ہیں :۔

۱ ۔ ملکیتِ زمین میں ایسی وسعتیں نہ پیدا ہونے دی جائیں جو جاگیردارانہ معاشرہ کو جنم دیں۔

۲ ۔ کسانوں میں ان زمینوں کی عادلانہ تقسیم ہوجائے جن کی بنیاد پر وہ اپنی استعداد کے موافق کام کرکے اپنی ضروریات کو پورا کرسکیں۔

وہ زمینیں جو حکومت کی ملکیت ہوں گی یا جن پر ان کا تصرف ہوگا۔ وہ مندرجۂ ذیل ہیں ۔

۱ ۔ وہ زمینیں جنھیں مسلمانوں نے جنگ کئے بغیر بلادِ کفر سے قبضہ میں لے لیا ہو۔ خواہ ان کے مالکوں کو وہاں سے نکال دیا گیا ہو یا خود انھوں نے بخوشی مسلمانوں کے سپرد کردی ہوں ۔ یہ انفال میں ہیں ۔

۲۔ وہ آباد زمینیں جو جنگ کے بعد حاصل کی گئی ہوں یہ مسلمانوں کی ملکیت ہیں لیکن ان پر امام کا تصرف ہوگا وہ انھیں اجارہ پر دے گا یا براہِ راست منفعت حاصل کرے گا اور اس کے محصولات کو مسلمانوں پر صرف کرے گا۔

۳۔ وہ غیر مزروعہ زمینیں جو جنگ کے بعد حاصل کی گئی ہوں۔ یہ امام کی ملکیت ہوں گی، وہ اس کی آبادکاری کے لئے آدمی مقرر کرے گا۔ یا انھیں ایسے لوگوں کو دیدے گا جو اسے آباد کرسکیں اور اس کی آمدنی کو سماجی کاموں پر صرف کرے گا۔

۴۔ حدودِ مملکتِ اسلامیہ کی غیر مزروعہ اور مردہ زمینیں امام کی ملکیت ہیں اور اسکی آمدنی قوم اور حکومت کے مفادات پر خرچ ہوگی۔ وہ غیر مزروعہ اور مردہ زمینیں خواہ قبلاً کسی کی ملکیت ہی میں نہ رہی ہوں جیسے دُور دراز کے صحرا اور بے آب وگیاہ ریگستان وغیرہ یا قبلاً ملکیت میں رہی ہوں لیکن اب اس کے مالک موجود نہ ہوں اور فنا ہو چکے ہوں تو ایسی زمینوں کو اگر کوئی شخص امام کی اجازت سے مزروعہ بنالے تو وہ حکومت کو زمین کا خراج ادا کرے گا اور زمینیں اس کے تصرف میں رہیں گی، اگرچہ وہ اس سے قبل کسی اور ہی کی کیوں نہ رہی ہوں۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے: ان الارض للّٰه یعلہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین انا واھل البیت الذین اورثنا الارض ونحن المتقون والارض کلھا لنا فمن أحییٰ أرضاً میتاً من المسلمین فلیعمرھا ولیؤد خراجھا الی الامام۔ زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور عاقبت متقیوں کے لئے ہے۔ ہم اور اہلبیتؑ وہ لوگ ہیں جو زمین کے وارث بنائے گئے ہیں اور ہم ہی متقی ہیں اور ساری زمین ہمارے لئے ہے تو مسلمانوں

میں سے جو شخص بھی مردہ زمین کو زندہ کرلے وہ اس پر کاشتکاری کرے اور امام کو اس کی لگان ادا کرے ۔

احیاء موات اور لگان کو نظام زراعت میں زیر بحث لایا جا چکا ہے ۔

۵ ۔ وقف شدہ اراضی کی تولیت امام کے ذمہ ہوگی ۔ اگر واقف نے ان کی نگرانی اور ان کے امور کے اجراء کے لئے کسی کو معین نہ کیا ہو ۔ ایسی اراضی اسلامی ملکوں میں بڑی مقدار میں موجود ہیں ۔ اسلام نے اس کی بڑی ترغیب دی ہے اور اسے واقف کے لئے صدقۂ جاریہ قرار دیا ہے ۔

اگر اسلامی ممالک میں اراضی کا نظام پیش کردہ طریقوں پر رائج ہوتا تو نہ تو جاگیرداری قائم ہوسکتی اور نہ کسانوں کو مشکلات پیش آتیں اور پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے کسی دوسرے مکتب کا ممنونِ احسان بھی نہ ہونا پڑتا ۔

مذکورہ بالا بیانات سے بخوبی واضح ہوگیا کہ مزروعہ وغیر مزروعہ زمینوں کا اکثر حصہ اسلامی معاشرہ میں حکومت کی ملکیت ہوگا ۔ حکومت مزروعہ اراضی پر یا تو خود اپنی نگرانی میں کاشت کرائے گی یا عدالت کے ساتھ کسانوں میں تقسیم کردے گی ۔ نیز یہ کہ غیر مزروعہ علاقوں کے لئے ایسے وسائل فراہم کرے گی جن سے وہ مزروعہ بن سکے ۔

۳ ۔ ساحلِ بحر

سمندروں اور دریاؤں کے ساحل پر جو زمینیں ہوں وہ انفال میں ہیں اور امام کی ملکیت ہیں ۔ یہ زمینیں مختلف اجناس کی کاشت کے لئے بڑی زرخیز ہوتی ہیں ، اس کے علاوہ ساحلی علاقے عموماً تجارت ، ماہی گیری ، سمندری سفروں وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں ۔ حکومت بحری تجارت کے ذریعہ درآمد و برآمد کرکے ایک اچھی رقم حاصل کرے گی ۔ اسی طرح درآمد و برآمد کرنے والوں پر ڈیوٹیاں لگا کر ان سے بھی رقم حاصل کی جاسکتی ہے ۔

۴۔ جنگلات اور جھاڑیاں وغیرہ

جنگلات ملکوں کی ایک اہم ضرورت ہوتے ہیں۔ ان سے عمارتی لکڑی، ایندھن، گندہ بروزہ اور لکڑی کا کوئلہ اور ان کے علاوہ دیگر مختلف قسم کے فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ انفال میں داخل ہیں اور امام کی ملکیت ہیں۔

۵۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور وادیاں

یہ بھی امام کی ملکیت ہیں اور اپنے معادن کی وجہ سے ایک بڑی دولت شمار ہوتے ہیں۔

۶۔ بادشاہوں کی اراضی

یہ وہ زرعی زمینیں ہیں جنھیں بادشاہوں نے اپنی رعایا سے ظلم وجور سے حاصل کیا ہو اور غصب کر لیا ہو۔ جب اسلام انھیں فتح کرے گا تو یہ زمینیں مفتوح بادشاہوں کے قبضہ سے نکل آئیں گی۔ یہ انفال میں ہیں اور امام کی ملکیت ہیں۔ امام ان کی آمدنی حکومتِ اسلامیہ کی رعایا پر صرف کرے گا۔

۷۔ معادن

یہ معادن جو کسی کی ملک میں نہ ہوں وہ امام کی ملکیت ہیں۔ معدنیات کی حیثیت خام مال کی ہوتی ہے جس کے بغیر صنعت آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

۸۔ سمندر، دریا، نہریں

یہ بھی انفال میں ہیں اور امام کی ملکیت ہیں۔ تجارت اور بحری مسافرتوں کی وجہ سے سمندر اہم اقتصادی درجہ رکھتا ہے۔ نیز اس کی اہمیت مچھلی اور دیگر سمندری مخلوقات اور اشیاء کی وجہ سے بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی طرح دریا بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے زمینوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ ان میں کشتی رانی کی جاتی ہے اور دیگر فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان سے بجلی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی حکومت کی آمدنی کا اہم ذریعہ ہیں۔ اور

چونکہ حکومتِ اسلامیہ کے سربراہ کی ملکیت ہیں اس لئے حکومت بجلی اور پانی کے محکمہ کو قومی ملکیت بنا سکتی ہے۔

۳۔ حکومت کے صنعتی اور زراعتی منصوبے

جیسے جیسے انسان سماجی طور پر ترقی کرتا جاتا ہے ویسے ہی ویسے اس کی ضروریات اور سماجی فلاح و بہبود کی چیزوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ٹیکس جو حکومت وصول کرتی ہے وہ ان کاموں کے لئے پورا نہیں ہوتا اور جب اس کی آمدنی اس کے اخراجات کے مقابل کم پڑتی ہے تو انہیں پورا کرنے کے لئے آمدنی کے دوسرے ذرائع کی تلاش ہوتی ہے۔

آج دنیا کی مختلف حکومتیں صنعت، تجارت اور زراعت کے وسیع تر منصوبے بنا رہی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ نئی آمدنی حاصل کی جائے اور اخراجات پورے کئے جائیں۔ معاشیاتِ اسلام میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو آمدنی کے نئے دروازے کھول لئے جائیں۔

صنعت و تجارت صنعت کا بیشتر خام مواد خواہ معدنی ہو یا نباتی وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے تصرف و اختیار میں ہے۔ پرائیوٹ صنعتی ادارے خام مواد میں سے ایک معین مقدار ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں عظیم تر صنعتی ادارے کھولنا صرف حکومت ہی کے امکان میں رہ جاتا ہے، اور اس طرح وہ ان صنعتوں سے اپنے لئے آمدنی پیدا کر سکتی ہے۔

صنعت اور تجارت میں حکومت کی مداخلت کا مقصد صرف یہی نہیں ہوگا کہ وہ اس سے آمدنی حاصل کرے بلکہ اس کی غرضِ اولین یہ ہوگی کہ اس کے ذریعہ ملک میں پیداوار اور تجارت کے حالات کو بہتر بنایا جائے اور قیمتوں میں توازن برقرار رکھا جائے۔

آج کے رائج نظاموں کے برعکس اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ تجارتی منڈیوں پر قبضہ کرلے اور ملک کی پیداوار پر اپنا تسلط قائم کرلے —— بلکہ اسلام کا خیال یہ ہے کہ انفرادی پیداوار پر تسلط قائم کرلینا پورے نظامِ پیداوار کو مفلوج کردینا ہے۔

اسلامی معاشرے میں جب حکومت تجارتی منڈیوں میں داخل ہوگی تو وہ حاکم کی حیثیت سے داخل نہیں ہوگی بلکہ جس طرح کوئی دوسرا تاجر تجارت میں قدم رکھے گا اسی طرح حکومت بھی اس میں شامل ہوگی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اس کی مادی استطاعت دوسروں سے زیادہ ہوگی۔

گزشتہ بیانات سے حکومت کے صنعتی اور تجارتی منصوبوں کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ :

۱۔ حکومت اس میں اسی طرح داخل ہوگی جیسے ایک عام صنعتکار یا تاجر داخل ہوتا ہے اور جس طرح لوگ آپس میں تجارتی تعلقات و روابط استوار کرتے ہیں وہ بھی استوار کرے گی اور اسے یہ حق نہیں ہوگا کہ اپنی طاقت کو بروئے کار لاکر منڈیوں پر چھا جائے اور دوسری پرائیوٹ صنعتوں کو بازار سے ہٹا دے۔

۲۔ کوئی بھی شخص یا کوئی بھی پرائیوٹ صنعتی ادارہ اسی قیمت پر یا اس سے کم قیمت پر حکومت کے مقابلہ میں اپنا مال بازار میں دے سکتا ہے۔

۳۔ حکومت کی اس مداخلت سے قیمتوں کی متوازن حد بندی ہوجائے گی اور منڈیوں میں ایک اعتدال آجائے گا جس سے ذخیرہ اندوزی بھی دور ہوگی اور دیگر صنعت کاروں کے منڈی پر چھا جانے کی صورتِ حال پر بھی کنٹرول ہوجائے گا۔

۴۔ اس تجارت وصنعت سے حکومت کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ منافع کما کر اپنے اخراجات پورے کرے۔

زراعت زراعت اور پیداوار کے حکومتی منصوبے بھی اس سلسلے کی اہم ترین کڑیاں ہیں۔ گزشتہ اوراق میں اگر تفحص کیا جائے تو اس کے واضح خطوط ہمیں نظر آئیں گے۔ وہ مزروعہ وغیر مزروعہ اراضی جو فتح کی گئی ہو یا جن کے مالک ان سے غیر متعلق ہو چکے ہوں اور ساری دارالاسلام کی غیر مزروعہ اراضی امام کی ملکیت ہیں۔ کوئی شخص اس کے اذنِ خاص کے بغیر ان میں تصرف نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ زرعی زمینوں میں سے اتنی مقدار اپنے لئے منتخب کرلے جو اس کی احتیاج سے زیادہ ہو اور دوسروں کو اس سے ضرر پہونچے یا اتنی بڑی زمین لے لے جو آگے چل کر زمینداراانہ نظام کی شکل اختیار کرلے۔ ایسی صورت میں وہ زمینیں جن پر افراد کاشتکاری نہیں کرسکتے انھیں حکومت اپنے زراعتی منصوبے کے تحت استعمال میں لائے گی اس لئے کہ صرف حکومت ہی میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ زمین کے کثیر رقبہ کو زراعت کے قابل بنائے اور ان سے آمدنی حاصل کرے۔

۴۔ قرض

حکومتِ اسلامیہ تعلیم وتربیت، صحت، زراعت یا فوجی منصوبوں یا رفاہِ عام کے کاموں مثلاً پل، بند، اسپتال، مدرسہ اور سڑکوں وغیرہ کے لئے اگر مذکورہ بالا ذرائعِ آمدنی کو ناکافی سمجھتی ہے تو ایسی صورت میں ان منصوبوں کو پورا کرنے کیلئے طویل المیعاد قرضے لے گی اور انھیں اقساط کی صورت میں ادا کرے گی جس کی مدت ممکن ہے کئی نسلوں تک ختم ہو لیکن ان قرضوں پر سود ادا کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اسلام کے مالیاتی نظام میں زکوٰۃ کے سہام میں ایک سہم مقروض لوگوں کے ادائے قرض کے لئے بھی ہے (جبکہ قرضہ جائز کام کے لئے لیا گیا ہو) حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ عام مسلمانوں کی طرح قرض کی ادائیگی کے لئے اس سہم کا مستحق ہوگا اور اس کے ذریعے بیت المال کی استطاعت کے مطابق اقساط میں اس قرض کو ادا کریگا۔

چونکہ ایسے منصوبوں کا فائدہ صرف موجودہ نسل سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ آنے والی نسلوں سے بھی متعلق ہے یا واضح تر لفظوں میں، موجودہ نسل کی بہ نسبت آنے والی نسل سے زیادہ متعلق ہوتا ہے اس لئے یہ قرضہ اگر کئی نسلوں میں ادا کیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ، جس نے قرض لیا ہے اس کے مرنے سے حکومتِ اسلامیہ فنا نہیں ہو جائے گی بلکہ وہ باقی رہے گی اور چونکہ قرض اسی کی طرف سے لیا گیا ہے اس لئے طویل المیعاد قرضوں کی ادائیگی بعد کے سربراہوں کے ذمہ ہوگی۔ اس اعتبار سے ایسے قرضوں میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

۵۔ ولایتِ عامہ

الف:۔ فئ: قرآن مجید میں کہا گیا ہے وما افاء اللہ علی رسولہ منھم فما أوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب ولکن اللہ یسلط رسلہ علی من یشاء واللہ علی کل شیءٍ قدیر (۶۔ حشر) اور جو کچھ اللہ نے ان کا مال اپنے رسول کو دیا تو تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ اس کے حصول کے لئے نہیں دوڑائے تھے لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس کا چاہتا ہے مالک بنا دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ــــــــ فئ وہ مال ہے جو

مشرکین سے مسلمانوں کو ملے لیکن اس کے لئے جنگ نہ ہوئی ہو، اس میں اموال منقولہ (رقم اور اثاث البیت وغیرہ) اور غیر منقولہ (زمین وغیرہ) دونوں ہی شامل ہیں۔ اس کا مالک حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ ہوگا تاکہ اسے حکومت کے مفادات اور اجتماعی کاموں میں صرف کرسکے۔

ب:۔ بے وارث کی میراث : امام مسلمانوں پر ولایتِ عامہ رکھتا ہے، اور اگر کوئی وارث نہ ہو تو امام اس کا وارث ہوگا، اور اس کی میراث بیت المال میں داخل کردی جائے گی۔

مذکورۂ بالا آمدنی کے ذرائع سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ حکومتِ اسلامیہ اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے آمدنی کے وسیع تر طریقے اپنے دامن میں رکھتی ہے، خواہ وہ اخراجات بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اب حکومت کے اخراجات پر بحث کی جاتی ہے۔

حکومت کے اخراجات کی مدیں

حکومتِ اسلامیہ جب افراد پر مالی ٹیکس فرض کرتی ہے تو اُن کی استطاعت کو دیکھ کر مساویانہ طور پر واجب کرتی ہے۔ اس میں کسی شخصی حیثیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ان کی تقسیم اور خدمات کی تقسیم بھی مساویانہ ہوگی۔

اخراجات کا ایک عام جائزہ

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ: انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفة قلوبھم وفی الرقاب والغارمین و فی سبیل اللّٰہ وابن السبیل (۶۰۔ توبہ) اموال زکوٰۃ فقیروں، مسکینوں اور انکے

لئے جو ان کی وصولی پر مقرر کئے جائیں اور ان کے لئے جن کے دلوں میں (دین کی) الفت پیدا کرنی ہے اور غلاموں کے لئے اور قرضداروں کے لئے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اس آیت سے مصارفِ زکوٰۃ کے دو اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ پہلے کے اعتبار سے اموالِ زکوٰۃ مستحقین کی ملکیت قرار پائیں گے اور دوسرے کی رو سے یہ رقم مستحقین پر صرف ہوگی ملکیت نہیں بنے گی۔ یہ چیز لام اور فی سے واضح ہوتی ہے۔ مستحقین کے ایک گروہ کے لئے ارشاد ہے کہ اموالِ زکوٰۃ فقراء، مساکین، عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے لئے ہیں۔ اس سے ان کی ملکیت کا اشارہ ہوتا ہے اور مستحقین کے دوسرے گروہ کیلئے ارشاد ہے کہ اموالِ زکوٰۃ غلاموں میں، مقروضوں میں، سبیل اللہ میں اور ابن السبیل میں استعمال کئے جائیں گے۔ اس سے ان حقوق کے سماجی ہونے کا اشارہ ملتا ہے، اس لئے یہ ملکیت نہیں ہوں گے۔ اس لئے حکومتِ اسلامیہ کے اخراجات دو قسم کے ہوں گے۔

۱۔ وہ اموال جو اشخاص پر صرف ہوں گے اور ان کی ملکیت بنیں گے۔
۲۔ وہ اموال جو معاشرہ کے لئے مخصوص ہوں گے لیکن ان کی ملکیت نہیں بنیں گے۔

اسی فرق کے پیشِ نظر مصارفِ زکوٰۃ پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

شخصی مصارف

مندرجۂ ذیل اشخاص پر صرف کئے جائیں گے۔ فقراء، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب۔

۱-۲: **فقراء و مساکین:** فقیر وہ ہے جس کے پاس ایک سال کی روزی نہ ہو اور ابھی تنگدستی پیدا نہ ہوئی کہ وہ مانگنے لگے اور مسکین وہ ہے جو غربت سے

مجبور ہو کر لوگوں کے دستِ سوال دراز کرے ۔ فقراء و مساکین اپنے انفرادی و اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے زکوٰۃ کے ایک حصہ کے مستحق ہیں۔

فقراء کی تین صورتیں ہیں :-

۱ ۔ کسی جسمانی خرابی یا مرض یا انتہائی پیری یا کسی ارضی و سماوی آفت کی وجہ سے انسان کسبِ معیشت سے عاجز ہو۔

۲ ۔ انسان کسبِ معیشت پر قادر ہو، اس میں کوئی جسمانی خرابی یا مرض وغیرہ بھی نہ ہو لیکن سماجی بہبود یا ملکی ضروریات کے کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ کسب نہ کر سکتا ہو، اس لئے اس کے پاس ایک سال کی روزی نہ ہو ۔

۳ ۔ انسان ہر اعتبار سے کسبِ معیشت پر قادر ہو لیکن اپنا وقت بے مصرف کاموں میں برباد کر رہا ہو اور اس کے پاس ایک سال کی روزی نہ ہو ۔

اسلامی معاشیات فقراء کے ان تین اقسام کے مختلف احکام بیان کرتی ہے۔

قسم اوّل

اگر جسمانی خرابی یا مرض یا بڑھاپے یا کسی آفت کی وجہ سے انسان محنت یا کسبِ معیشت سے مجبور ہو تو وہ زکوٰۃ کے مستحقین میں ہے ۔ امیر المومنینؑ اس قسم کے بارے میں جناب مالکِ اشترؒ کو تحریر فرماتے ہیں : ثم الله الله فی الطبقة السفلیٰ من الذین لا حیلة لهم والمساکین والمحتاجین واهل البؤسی والزمنی فان فی هذه الطبقة قانعا ومعترا احفظ الله ما استحفظك من حقه فیهم واجعل لهم قسما من بیت مالك وقسما من غلات صوافی الاسلام فی كل بلد فان للأقصیٰ منهم مثل الذی للأدنی وكل من استرعیت حقه فلا یشغلنك عنهم البطر ——— وتعهد اهل الیتم و ذوالرقة فی السن ممن لا حیلة له ولا ینصب للمسئلة نفسه ۔ الله کا خوف،

کمزور پست طبقہ کے بارے میں جن کا کوئی سہارا نہیں اور جو غریب، مسکین، محتاج اور آفت رسیدہ ہے کیونکہ اس طبقہ میں قناعت کرنے والے بھی ہیں اور مانگنے والے بھی۔ اور خدا کا وہ حق محفوظ رکھو جس کی حفاظت کا اس نے تم کو حکم دیا ہے اور ان کیلئے اپنے بیت المال اور اسلام کی ان زمینوں کے غلات میں سے جو غنیمت میں حاصل ہوئی ہیں ہر شہر کا ایک حصہ مقرر کردو کیونکہ ان میں سے دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے کا بھی وہی حق ہے جیسا کہ قریب رہنے والوں کا ہے۔ اور تم ہر ایک کے حق کے نگراں بنائے گئے ہو۔ پس تمہیں حکومت کا غرور ان سے غافل نہ کرنے پائے۔ —— —— ان یتیموں اور بوڑھوں کی خبر گیری کرو جو نہ خود اپنی مجبوری کا کوئی چارہ کار رکھتے ہیں اور نہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔

قسم دوم :

اگر انسان دینی، سماجی، ملکی یا قومی کاموں میں مشغول ہے اور اسے کسبِ معاش کا وقت نہیں ملتا مثلاً جو لوگ حکومتِ اسلامیہ میں مدرس ہوں یا ڈاکٹر ہوں یا پولیس اور فوج کے محکموں میں ہوں یا حکومت کے دفاتر میں ہوں تو ایسے اشخاص بھی زکوٰۃ کے مستحق ہوں گے، اس لئے کہ اسلامی معاشیات فقراء سے صرف مانگنے والوں زمین گیر افراد یا مریضوں ہی کو مراد نہ لیں بلکہ اس میں ہر وہ شخص شامل ہے جس کے پاس پورے ایک سال کے اخراجات نہ ہوں۔ ان میں ایسے بھی ہوں گے جن کے پاس عالی شان مکانات ہوں، سواری ہو اور نوکر اور دوسری ضرورت کی چیزیں بھی ہوں۔ فقہِ اسلام میں اس بات کی صاف طور پر وضاحت کردی گئی ہے۔ سید ابو الحسن اصفہانی وسیلۃ النجات میں تحریر کرتے ہیں کہ "گھر کا خادم، سواری جو اس کے لئے ضروری اور حسبِ حال ہو خواہ وہ اس کے عزت و شرف ہی کے لئے ہو، جاڑے گرمی اور سفر و حضر کے لباس اگرچہ زینت ہی کے لئے ہوں، فرش اور برتن اور ان کے علاوہ

اور چیزیں بھی ہوں جب بھی اسے زکوٰۃ دی جائے گی۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں صرف اتنا ہی نہیں دیا جائے گا جو ان کی ضروریات کا سدِّباب کردے بلکہ ان کی سہولتوں کو بھی مدّنظر رکھا جائے گا اور اس کی سماجی حیثیت بھی برقرار رکھی جائے گی۔ متعدد احادیث بھی اس مطلب کی وضاحت کرتی ہیں۔

امام محمد باقرؑ سے سوال کیا گیا کم یعطی الرجل من الزکوٰۃ؟ فقال أعطہ من الزکوٰۃ حتیٰ تغنیہ۔ ایک آدمی کو زکوٰۃ میں سے کتنا دیا جائے؟ فرمایا زکوٰۃ میں سے اتنا دو کہ وہ مستغنی ہو جائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا: اعطی الرجل من الزکوٰۃ مائۃ درہم؟ قال نعم قال مائتین؟ قال نعم قال خمسمائۃ؟ قال نعم حتیٰ تغنیہ۔ کیا میں ایک شخص کو زکوٰۃ میں سے سو درہم دیدوں؟ فرمایا ہاں۔ پوچھا دو سو؟ فرمایا ہاں۔ پوچھا پانچ سو؟ فرمایا ہاں۔ یہاں تک کہ وہ مستغنی ہو جائے۔

جیسا کہ یہاں بیان کیا جا چکا ہے، زکوٰۃ ایک حق ہے۔ اس لئے معاشرہ کے معزز افراد کا مالِ زکوٰۃ کو قبول کرنا ان کے کمتر ہونے کا سبب نہیں ہوگا۔ جس طرح وہ حکومتِ اسلامیہ پر دوسرے بہت سے حقوق رکھتے ہیں اسی طرح یہ بھی ان کا ایک حق ہے۔ اس میں معلم و مدرس، علماء و فقہاء، حاکم و قاضیٔ شہر، طبیب، ڈاکٹر، پولیس، فوجی اور حکومتی دفتروں میں کام کرنے والے، سب شامل ہیں۔ حکومت انھیں سہولتیں مہیا کرے گی تاکہ وہ پورے انہماک سے حکومتی اور اجتماعی کاموں میں دلچسپی لے سکیں۔

قسم سوم

حکومتِ اسلامیہ ایسے لوگوں کو بیت المال سے کسی قسم کا وظیفہ نہیں دے گی جو ہر

اعتبار سے کسبِ معاش اور کام کرنے کی صلاحیت و مقدرت رکھتے ہوں اس کے باوجود اپنا وقت بیکار اور بیہودہ کاموں میں صرف کر رہے ہوں۔ شیخ محمد حسنؒ نے جواہر میں تحریر کیا ہے: فمن یقدر علی اکتساب مایمون نفسہ و عیالہ علی وجہ یلیق بحالہ لا تحل لہ، لانہ کالغنی۔ تو جو شخص اپنے مناسبِ حال روزی اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کمانے کی قدرت رکھتا ہو اس کے لئے زکوٰۃ جائز نہیں ہے اس لئے کہ وہ غنی کے مثل ہے۔

۳۔ عاملینِ زکوٰۃ: یہ وہ لوگ ہیں جو مالگذاریوں اور محصولات کو جمع کرتے ہیں، ان کے حسابات مرتب کرتے ہیں اور اس سے متعلق دیگر امور کی انجام دہی کرتے ہیں۔ ان کا بھی زکوٰۃ میں ایک حصّہ ہے۔

۴۔ مؤلفۃ القلوب: ایسے کفار جو مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر جہاد کرنے پر مائل ہو سکیں یا کمزور عقیدہ کے مسلمان جو سرحدوں کے تحفظ یا ملک کے امن کو برقرار رکھنے پر مائل ہو سکیں یا ایسے لوگ جو ضعیف العقیدہ ہوں اور انھیں مال دینے سے ان کے اعتقاد میں پختگی آئے گی۔ ان کا بھی زکوٰۃ میں ایک حصّہ ہے۔

سماجی مصارف

اس کے موارد مندرجۂ ذیل ہیں۔ غلام، مقروض، سبیل اللہ۔

۱۔ یہ مصارف کسی خاص فرد سے مخصوص نہیں اور نہ کسی خاص فرد کی ملکیت قرار پائیں گے بلکہ سماجی بہبود اور مفاداتِ عامّہ کے لئے ہیں۔

۲۔ اس قسم کے مصارف صرف فقراء سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ عام اسلامی معاشرہ سے متعلق ہیں جیسا کہ کاشف الغطاء نے تحریر کیا ہے۔ لا یعتبر فی المدفوع

الیہ الاسلام والایمان ولاعدالۃ ولافقر ولاغیرذالک ۔

اس کے مستحق کے لئے اسلام، ایمان، عدالت اور فقر وغیرہ کی کوئی شرط نہیں ہے اس لئے کہ جب زکوٰۃ کے یہ مصارف مفاداتِ عامہ کے لئے ہیں تو انھیں مومن یا مسلمان یا عادل اور فقیر وغیرہ کی قید لگا کر مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اس رقم سے غلاموں کو آزاد کرایا جائے گا۔ قرضداروں کے قرضوں کی ادائیگی کی جائے گی اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے گا۔ سبیل اللہ (اللہ کی راہ) سے مراد وہ راہ ہے جو خدا کی مرضی تک پہونچا دے۔ اس میں سارے دینی و اجتماعی امور شامل ہو جاتے ہیں۔ شیخ محمد حسنؒ اپنی کتاب جواہر میں تحریر فرماتے ہیں۔ فلا ریب حینئذ فی ان الاقوی عموم سبیل اللہ لکل قربۃ ـــــ من بناء الخانات وتعمیر روضۃ أو مدرسۃ أو مسجد أو احداث بناءھا أو وقف ارض او تعمیرھا ـــــ أو تزویج عزاب أو غیرھا ـــــ أو اعطاء اھل الظلم و الشر لیخلص الناس من ظلمھم أو اعطاء من یدفع الظلم عن الناس ـــــ وشراء الاسلحۃ لدفاعھم۔ کوئی شک نہیں کہ زیادہ قوی قول یہ ہے کہ ہر وہ کام جو قصدِ قربت سے ہو وہ سبیل اللہ میں داخل ہے ـــــ جیسے مسافر خانے، روضہ، مسجد کی تعمیر یا مرمت یا زمین کا وقف یا اس کی آبادکاری ـــــ یا کنواروں کی شادی وغیرہ ـــــ یا ظالموں اور شریروں کو رقم دینا تاکہ لوگ ان کے ظلم و شر سے بچ جائیں یا اس کو دینا جو لوگوں پر سے ظلم کو دفع کرے ـــــ یا ان کے دفاع کے لئے اسلحہ کی خرید۔

اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ہر وہ امر جو اسلامی معاشرہ کے لئے مستحسن ہو اسے فی سبیل اللہ میں شمار کیا جائے گا، اور زکوٰۃ کا ایک حصہ اس کے لئے مخصوص ہوگا۔

خمس کے اخراجات کا جائزہ

واعلموا ان ما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامی والمساکین وابن السبیل (۴۱۔ انفال) اور جان لو کہ جو کچھ تمہیں نفع ہو تو اس کا پانچواں حصّہ اللہ کے لئے اور رسولؐ کے لئے اور (رسولؐ کے) قرابتداروں کے لئے اور مسکینوں کے لئے، اور مسافروں کے لئے ہے۔

اس آیت کی روشنی میں آمدنیوں اور غنیمتوں کا خمس چھ حصّوں پر منقسم ہے۔ اللہؐ، رسولؐ، ذی القربیٰ (رسولؐ کے بعد اولوالامر)، یتیم۔ بنی ہاشم، مسکین بنی ہاشم، مسافر بنی ہاشم۔ ان میں سے ابتدائی تین حصے اولوالامر کی طرف راجع ہوں گے۔ ولی امر انھیں حکومت کے خصوصی مفادات و احتیاجات اور دیگر عام اجتماعی ضروریات میں صرف کرے گا۔ یہ حکومت کی بہت بڑی آمدنی ہے جو پوری قوم کی مجموعی آمدنی کا دسواں حصّہ ہے۔ اور آخر کے تین حصّے بنی ہاشم کے لئے ہیں۔ اگر ان کی حاجت زیادہ ہے اور رقم کم تو اسے ولی امر کے حصہ سے پورا کیا جائے گا اور اگر رقم ان کی ضرورتوں سے زائد ہے تو وہ ولی امر کے حصہ میں داخل کر لی جائے گی (مصباح الفقیہ بحث زکوٰۃ) خمس بنی ہاشم سے اس لئے مخصوص کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ میں ان کا کوئی حق نہیں ہے۔

مذکورہ بالا ابتدائی حصہ کی رقم اتنی زیادہ ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سے صنعتی اور دیگر عظیم منصوبے عملی جامہ پہن سکتے ہیں اور بہت سے رفاہی کام انجام پا سکتے ہیں۔

ابتدائی تینوں حصّے رسولؐ کی یا ولی امر کی ذاتی ملکیت نہیں ہیں اس لئے انھیں اللہ پر عطف کیا گیا ہے اور اللہ کی رقم اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ وہ عام حکومتی امور کے لئے ہے، اسی طرح نبی کا حصّہ بھی اس کی وفات کے بعد حکومتی امور

کے لئے مخصوص ہوگا، اور ولی امران دونوں حصّوں کا وارث ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کی ذاتی ملکیت ہوں گے بلکہ وہ نبیؑ کے بعد چونکہ مصالح مسلمین کا نگہبان ہے اس لئے اس رقم کو اجتماعی اور حکومتی امور میں صَرف کرے گا۔ غیبتِ امامؑ کی صورت میں فقیہِ جامع الشرائط اس کا نائب ہوگا اور یہ سہام اسے ملیں گے۔ اس کی وجہ نیابت ولیؑ امر ہے۔

چند اہم مآخذ

۱ ۔	قرآن مجید		
۲ ۔	نہج البلاغہ	.. ..	امیرالمومنین حضرت علیؑ
۳ ۔	اصول کافی	.. ..	محمد بن یعقوب کلینیؒ
۴ ۔	بحارالانوار	.. ..	محمد باقر مجلسیؒ
۵ ۔	جواہرالکلام	.. ..	شیخ محمد حسنؒ
۶ ۔	مکاسب	.. ..	شیخ مرتضیٰ اخباریؒ
۷ ۔	وسیلۃ النجات	.. ..	سید ابوالحسن اصفہانیؒ
۸ ۔	مستمسک	.. ..	سید محسن حکیمؒ

اور دیگر کتب

اختتامیہ

گزشتہ مباحث میں جس مسلسل خطِ فکر کا اظہار کیا گیا وہ یہ ہے کہ دنیا کے بڑے اقتصادی نظاموں کے مقابلے میں اسلامی معیشت کا نظام وہ واحد سہارا ہے جو انسانیت کو اس کے مسائل سے نجات دلانے کی ضمانت دیتا ہے اور ایک اعلیٰ ترین اور کامل ترین معاشرے کی تشکیل کا دعویدار ہے اور اس دعوے کی صداقت اس لئے مسلّم ہے کہ اس نظام کا خالق کوئی انسان نہیں ہے بلکہ انسانوں کا خالق ہے ——
انسانی اور الوہی نظام کے فرق کو سمجھنے کے لئے ایک بنیادی نکتہ کا سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا کا کوئی انسان یا انسانوں کی کوئی جماعت جب کسی مسئلے کا حل تلاش کریگی تو فطری طور پر اس حل کے مزاج میں محدودیت ہوگی اس لئے کہ حل پیش کرنے والے کے ذہن و عقل پر اس کے خاندانی روایات کی چھاپ ہوگی، اس کے معاشرے کا اثر ہوگا اور وہ جس ملک کا باشندہ ہے اس کے جغرافیائی، سیاسی اور سماجی حالات کی شدید گرفت ہوگی لہٰذا وہ حل ایک محدود دائرے میں رہنے والے افراد کے لئے تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے لیکن اسے عالمگیر انسانی مسائل کا حل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس وہ اللہ جو اس کائنات کا خالق ہے، انسان اور اس کی فطرت کا خالق ہے، جو جغرافیہ اور معاشرہ کا خالق ہے، اس کا دیا ہوا حل اس کرۂ ارض پر بسنے والی پوری انسانی برادری کیلئے یکساں قابلِ قبول ہوگا۔

بھرپور معیشت اور ایمان باللہ

گزشتہ اوراق میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ کسی نظام کے رہنما اصولوں میں ایمان باللہ یا اس کی عبادت یا اس سے وفاداری کا اظہار شامل نہیں ہے جبکہ اسلامی معیشت کے رہنما اصولوں میں ایمان باللہ اصل اول ہے۔ سورۂ نحل میں ایک بستی کی مثال

بیان کرتے ہوئے قرآنِ مجید نے بڑے واضح الفاظ میں اسے سمجھایا ہے : وضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت آمنۃ مطمئنۃ یاتیھا رزقھا رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون (۱۱۲) اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے جس میں امن و اطمینان تھا اور ساری دنیا سے کھنچ کر رزقِ وافر پہونچ رہا تھا تو بستی کے رہنے والوں نے کفرانِ نعمت کیا جس پر اللہ نے انھیں ان کے کرتوت کے بدلے میں بھوک اور خوف کو مسلط کر دیا۔ یہ اگرچہ ایک مثال ہے لیکن عالمگیر حقیقت بھی یہی ہے کہ غاروں کے عہد سے لے کر آج کی سر بفلک عمارتوں کے عہد تک فقط دو ہی مسئلے نسلِ انسانی کی الجھنوں کا سبب بنے رہے اور وہ ہیں بھوک اور خوف۔ یہ وہ بین الاقوامی انسانی مسائل ہیں جن سے اس عہد کا کوئی شخص بھی غیر متعلق نہیں رہ سکتا اور قرآن نے ان دونوں مسائل کا سبب کفرانِ نعمت کو قرار دیا، اور پھر سورۂ قریش میں ان دونوں مسائل کے حل پر گفتگو کی فلیعبدوا رب ھذا البیت، الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف (۵/۴) پس قریش پر لازم ہے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف جیسے بھیانک امراض سے محفوظ رکھا۔ اسی بات کو سورۂ اعراف میں الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض (۹۶) اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان اور تقویٰ کے ساتھ رہتے تو ہم ان کے لئے آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ یہ اسلامی معیشت کا وہ مابعد الطبعیاتی عنصر ہے جو دنیا کے سارے نظام ہائے معیشت میں مفقود رہا ہے اور یہی وہ مرکزی عنصر ہے جس کے گرد اسلام کا پورا نظام گھوم رہا ہے۔

بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ایمان باللہ ایک حقیقت سہی لیکن کسی معاشی نظام میں کیا خرابی واقع ہو جائے گی؟ اگرچہ اس کا جواب بہت طویل ہے اور ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے بہت سے صفحات کا طلبگار ہے لیکن چونکہ یہ ایک طویل مقالہ ہے تفصیلی کتاب نہیں ہے لہٰذا فقط اشاروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ایمان کا حقیقی مفہوم

ایمان اگرچہ دنیا کے ان مشہور و معروف الفاظ میں ہے جس کے معنی سے کم و بیش ہر انسان باخبر اور مانوس ہے لیکن درحقیقت مجرّد مفہوم ہونے کے سبب اپنے اندر بے شمار دقیق مباحث کا حامل ہے یہی سبب ہے کہ صاحبانِ فکر کے نزدیک انسانی فکر کی جتنی بھی سطحیں شمار کی جا سکتی ہیں اتنے ہی درجات ایمان کے بھی ہیں۔ لہٰذا ہر انسان کا ایمان دوسرے انسان کے ایمان سے مختلف ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ایمان وہی ہوگا کہ جس چیز کا زبان سے اقرار کیا جا رہا ہے اسے دل سے بھی تسلیم کیا جائے، بلکہ قرآن کی اصطلاح میں کھلے دل سے تسلیم کیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے مطالبہ کیا کہ اے ایمان لانے والو ایمان لاؤ۔ یعنی یہ مطالبہ اس ایمان کا ہے جو حقیقت میں مطلوب خدا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب زبان سے ایمان کا اقرار کر لیا جائے تو پھر یہ اقرار ان کی پوری زندگی پر طاری ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ زبان سے اقرار ہو اور عمل سے انکار ہو یا بعض چیزوں پر ایمان ہو اور بعض سے انکار ہو اور اگر ایسا ہوا تو پھر یہ ایمان نہ ہوگا۔

اگر مندرجۂ بالا اصول منطقی اور قابلِ تسلیم ہے تو پھر معیشت میں ایمان کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ پر ایمان لانے والا اس کے بھیجے ہوئے فلسفۂ معیشت پر مکمل ایمان لائے گا۔ اور اس کے جزئیات و تفاصیل کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مکمل طور پر رائج اور نافذ کرنے کی کوشش کرے گا، اس لئے کہ کسی بھی معاشرے کی تشکیل میں اور کسی بھی نظام کے اجرا و نفاذ میں عقیدہ اور ایمان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اور جب

اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت اپنے پورے تفصیلات و جزئیات کے ساتھ معاشرہ میں نفاذ پذیر ہوگی تو پھر کوئی سبب نہیں کہ اس معاشرے پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے نہ کھلیں۔ شریعتِ اسلامی جسے کم و بیش باؤن ابواب پر تقسیم کر کے مدوّن کیا گیا ہے اور جو انسانی زندگی کے ہر ہر لمحے اور ہر ہر مسئلے پر محیط ہے۔ اُس میں ان ابواب کی تعداد ایک چوتھائی ہے جن کا تعلق اسلام کے نظمِ معیشت سے ہے اور جن پر فقہا نے بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں، ضرورت فقط اس بات کی ہے کہ انھیں جدید طریقے سے مدوّن کر کے عصرِ حاضر سے ہم آہنگ کیا جائے۔ وہ ابواب یہ ہیں۔ زکوٰۃ، خمس، تجارت، شراکت، مضاربت، اجارہ، حوالہ، مزارعت، مساقات، احیاء موات، غصب اور خراج وغیرہ۔

فلسفۂ معیشت

مندرجۂ بالا بحث میں یہ بات واضح ہو چکی کہ اللہ کے بھیجے ہوئے فلسفۂ معیشت پر مکمل ایمان ضروری ہے۔ لیکن اس منزل پر یہ آخری مسئلہ اب بھی حل طلب ہے کہ اس کا فلسفۂ معیشت کیا ہے؟ قرآن مجید کی مخصوص علم یا فن کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی ضروریات سے متعلق جتنے بھی علوم و فنون ممکن ہیں ان سب کو انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں اس کتاب میں معاشیات کے اصطلاحی مسائل نظر نہیں آتے لیکن اس کے ساتھ ہی فلسفۂ معیشت پر بھرپور اور مکمل گفتگو ملتی ہے۔ تفصیلات سے قطعِ نظر اس فلسفہ کی دو بنیادیں ہیں:-

(۱) انسان کا بنیادی استحقاق کیا ہے؟

(۲) اس استحقاق کی ضمانت کیا ہے؟

معاشی استحقاق

اس دنیا کے پہلے انسان نے جب کتمِ عدم سے عرصۂ وجود میں قدم رکھا تو قصۂ آدمؑ و ابلیس نے جنم لیا جسے قرآن مجید نے

مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک مقام یہ ہے: فقلنا یا آدم ان ھذا عدو لک و لزوجک فلا یخرجنکما من الجنۃ فتشقٰی، ان لک الا تجوع فیھا ولا تعریٰ (سورہ طٰہ ۱۱۷، ۱۱۸) پھر ہم نے کہا کہ اے آدم یہ (ابلیس) تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں یہ تم دونوں کو جنت سے باہر نہ نکال دے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے اور یہ تمھارے لئے طے ہے کہ نہ تم اس جنت میں بھوکے رہو اور نہ برہنہ۔ انسانی زندگی کے تین ہی بنیادی مسائل ہیں، اسے رہائش کے لئے گھر، بھوک رفع کرنے کے لئے خوراک اور تن ڈھانپنے کے لئے لباس کی ضرورت ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں لفظ "لک" (یعنی تمھارے لئے طے ہے اور یہ تمھارا استحقاق ہے) کلیدی اہمیت کا حامل ہے یعنی یہ انسان کا ذاتی استحقاق ہے کہ اسے گھر، لباس اور غذا فراہم کی جائے، یعنی یہ انسانی ضروریات کے پورا کرنے کا قرآنی منشور ہے۔

ضمانت: اب ضمانت کیا ہے کہ یہ ضروریات پوری ہوں گی؟ اس لئے کہ معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ انسانی احتیاجات لامحدود ہیں جبکہ وہ وسائل جو انسان کی احتیاجات کو پورا کرتے ہیں محدود ہیں اسی لئے انسانوں کو انکا پورا حق نہیں مل پاتا۔ اگرچہ یہ اصول متروک اور پارینہ ہے اور اسے علمی نتائج نے غلط ثابت کر دکھایا ہے لیکن اس مقام پر یہ ناگزیر ہے کہ قرآن کا فلسفہ اس فلسفہ کے بالکل برعکس ہے وہ انسان کو اسکے تمام احتیاجات کے پورا ہونے کی ضمانت یہ کہہ کر دیتا ہے کہ اللہ کی نعمتیں لامحدود ہیں اور تمھارے سوالات و احتیاجات محدود ہیں جیسا کہ سورۂ ابراہیم میں کہا گیا ہے واتاکم من کل ماسئلتموہ، وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ان الانسان لظلوم کفار (۱۴/۳۴) جو کچھ تم نے اس سے مانگا وہ سب کچھ اس نے تمھیں دیدیا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو احاطہ نہیں کر سکتے یقیناً انسان بہت ظالم اور ناشکرا ہے۔